چراغ دیر و حرم

م [illegible] حسین

Rekhta

آفاق کا ہر جلوہ اپنا ہی کرشمہ ہے
آئینوں میں اپنی ہی تصویر نظر آئی

ڈاکٹر سید صفدرؔ حسین

Pdf, By Misken Mazhar Ali Khan

Cel No, 00966590510687

گروپ، خاکہ، حلم

چراغِ دیر و حرم

ڈاکٹر [illegible]

rekhta

چراغِ دیر و حرم

rekhta

طبع اوّل ایک ہزار

سالِ طبع ۱۹۶۴ء

کتابت سیّد تہذیب حسین امروہوی

مطبوعہ جاوید پریس ۔ کراچی

قیمت چار روپے

ناشر

بارگاہِ ادب، ۵/۱۳۰۲ ڈرگ کالونی۔ کراچی ۲۵

rekhta

مجموعۂ غزلیات

rekhta

رہِ طلب میں اندھیرا نہیں اُجالا ہے

یہ جلوہ گاہِ خدا ہے وہ جلوہ گاہِ صنم

تجلّیِ دلِ ایماں، ضیائے دیدۂ کفر

قدم قدم پہ فروزاں چراغِ دیر و حرم

rekhta

اِنتساب

اُن غزالوں کو مری چشمِ تمنّا کا سلام
قافلے جن کے بنارس سے نجف تک پہنچے

rekhta

فروغِ دیدۂ دل سُرمۂ نگاہ بَنے

تمہاری راہ کے ذرّے بھی مہر و ماہ بَنے

rekhta

ترتیب

تاثرِ ذات
(سیّد مجتبیٰ حسین)

تاثرِ فن
(مختار صدیقی)

فکرِ گاہ گاہ
(غزلیاتِ زمانۂ ماضی قریب)

کاوشِ پیہم
(غزلیاتِ زمانۂ ماضی بعید)

نوائے پریشان

rekhta

تاثرات

ڈاکٹر سید صفدر حسین سے پہلے پہل میری ملاقات کراچی سے نکلنے والے ایک ادبی ماہنامہ کے دفتر میں ہوئی۔ رسمی تعارف کے بعد ہی صفدر صاحب نے میری کتاب پر نہیں بلکہ کتاب کے سلسلہ میں بعض ناقدوں کی رائے پر تبصرہ شروع کر دیا۔ وہ بے لاگ لہجے میں گفتگو کر رہے تھے۔ باتوں میں کوئی پیچ، کوئی کپٹ، اظہارِ رائے میں کوئی جھجک، کوئی ڈپلومیسی نہیں تھی، یہ ضرور ہے کہ باتیں وہ رُک رُک کر رہے تھے۔ آواز نہ تیز تھی نہ دھیمی۔ جب کسی نکتہ پر ضرور دینا چاہتے، ذرا سا توقف کرتے، نظریں جھکاتے، ذرا سے سکوت کے بعد نظریں اُٹھا کر آنکھیں ملا کر وہ "نکتہ" برملا کہہ دیتے۔ اُن کا لہجہ براہِ راست تھا۔ اس لہجے میں تھوڑا سا "اکھڑپن" بھی ملا ہوا تھا۔ یہ نہیں کہ صفدر صاحب کے الفاظ میں کوئی درشتی یا جارحیت تھی۔ اُن کے الفاظ بچے تلے اور شائستہ تھے مگر جو لہجہ انھیں ادا کر رہا تھا وہ ان الفاظ کو کبھی نرما رہا تھا کبھی گرما رہا تھا۔ اس میں کبھی مبارزت طلبی کبھی صلح جوئی تھی۔ مجھے صفدر صاحب کی بعض باتوں سے اختلاف تھا —— مگر اُن کا لہجہ جو اس وقت قدرے "کھردرا" معلوم ہو رہا تھا مجھے متاثر کئے بغیر نہ رہ سکا۔

rekhta

اس کمزوری سے جو بہت عام ہے، بچے ہوئے ہیں۔ ہر قسم کے ادبی نظریات کو سُننے اور سمجھنے پر وہ تیار رہتے ہیں۔ جدید ادب ہو یا قدیم دونوں سے اُنہیں والہانہ شغف ہے۔ ادبی معاملات میں وہ تنگ نظری سے کام نہیں لیتے۔ اگر وہ چاہیں بھی تو ایسا نہیں کر سکتے۔ اُن کی بے چین اور ہمہ وقت سرگرم جستجو شخصیت انھیں توہمات اور تعصبات کی زنجیریں توڑنے پر برابر اُکساتی رہتی ہے۔

صفدر صاحب کا ادبی مطالعہ وسیع اور گہرا ہے۔ وہ اعلیٰ پایہ کے محقق بھی ہیں اور ناقد بھی۔ مگر علمی اور ادبی مباحث پر گفتگو کرتے وقت اُن کی باتوں میں گراں باری اور خشکی نہیں پائی جاتی۔ اُن کی جاندار شخصیت، خشک مباحث کو بھی گوارا، دلکش اور دلچسپ بنا دیتی ہے۔ اُن کی گفتگو میں ایک خاص قسم کی سادگی اور شعریت ہے۔ گفتگو کی یہی شعریت اُن کی نظموں میں بھی ملتی ہے —— صفدر صاحب شاعر بھی ہیں اور نظموں کو پڑھتے بھی خوب ہیں۔ میں نے اُن کو مضمون پڑھتے بھی سُنا ہے اور اشعار بھی۔ دونوں چیزوں کو وہ اس طرح پڑھتے ہیں کہ مفہوم کی دلکشی بڑھ جاتی ہے۔ اُن کی شعر خوانی بالخصوص ایک انفرادی رنگ اور لطف رکھتی ہے۔ برمحل اور مناسب اشاروں، لہجے کے اُتار چڑھاؤ اور چہرے کے تاثرات سے وہ ایک ڈرامائی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ اور شعر اپنی پوری معنویت اور حُسن کے ساتھ مجسّم ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ صفدر صاحب صحیح معنوں میں بڑے باکمال فن کار ہیں۔ ادب اُن کی تحریر اور تقریر دونوں میں فن کی پختگی بن کر اُبھرتا ہے۔

صفدر صاحب ادب اور زندگی دونوں میں طہارت اور نفاست

کے حامل ہیں۔ اسی وجہ سے اُن کی نجی زندگی، اُن کی ادبی زندگی، اُن کی مجلسی زندگی میں کوئی ٹکراؤ یا تضاد نہیں ہے۔ وہ غیر منقسم اور مربوط شخصیت کے آدمی ہیں۔ اُن کو سمجھنے میں دِقّت نہیں پڑتی۔ اُنھیں سمجھنا ہو تو اُن کی گفتگو سُن لیجیے —— اور آپ کو صفدر صاحب اُس میں گلے ملتے ہوئے، رُوٹھتے ہوئے، مَنتے ہوئے، بحث کرتے ہوئے، تنقید کرتے ہوئے، شعر پڑھتے ہوئے، سوچتے ہوئے، گُنگناتے ہوئے، ہنستے ہوئے، قہقہے لگاتے ہوئے اور کبھی کبھی چُپکے چُپکے آنسو بہاتے ہوئے ل جائیں گے۔ اُن کے ہاں کوئی چیز تہہ در تہہ اور لبادہ پہنے ہوئے نہیں، جو چیز ہے، جیسی بھی ہے، سامنے ہے۔ اُن کے چہرے کی طرح ان کا دل بھی روشن ہے —— ایسی روشنی بہت کم لوگوں کو ملتی ہے —— اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ اپنے دوستوں کے لیے ایک روشنی ہیں۔

مجتبیٰ حسین، کراچی
۳۱ر دسمبر ۶۳ء

rekhta

تاثرِ فن

یہ کس کے لب ہیں زمزمہ پرداز دیکھنا
رقصاں ہے دل میں شعلۂ آواز دیکھنا

ترا انکار جھوٹا ہے کہ تیرا دل دھڑکتا ہے
تبسّم کوش آنکھوں میں جھلک آئی نمی کیسی

آفاق کا ہر جلوہ اپنا ہی کرشمہ ہے
آئینوں میں اپنی ہی تصویر نظر آئی

ہو چکے اہلِ یقیں وادئ اوہام میں گُم
اہلِ شک منزلِ الہام تک آپہنچے ہیں

رنجِ بے چارگیٔ جذبۂ اِصلاح نہ پوچھ
کہ فسادِ ازلی خلقتِ تعمیر میں ہے

ہر سانس ایک گام ہے، ہر لمحہ اک سفر
منزل تھکن کا نام ہے دنیا سفر میں ہے

صفدر صاحب کے یہ اشعار ایک سرسری نظر نے "چراغِ دیر و حرم" کی تجلّیوں میں دیکھے ہیں۔ اِن کا تعلق اُن کی شعری زندگی کے مختلف ادوار سے ہے لیکن اِن کے پیچھے شعری شخصیت کا جو لب و لہجہ کارفرما ہے۔ اُس کی دو نہایت

rekhta

نمایاں خصوصیتیں صاف طور پر ہر جگہ مشترک نظر آتی ہیں۔ یعنی کلام کی گرمی اور بیان کی جزالت۔ مندرجہ بالا اشعار کو ہی دیکھئے۔ پہلا شعر محفلِ ناز کے محاکات کا ایک خاص منظر ہے۔ ایسے محاکات میں گرمیٔ کلام متوقع ہے۔ دوسرا شعر اس سے بھی مختص نوعیت کا ہے۔ اِس کے محلِ وقوع میں صرف دو شخصیتیں موجود ہیں۔ ایک تو شاعر دوسرے اُس کا مقصودِ تمنا۔ اِس محلِ وقوع میں کہ شاعر ملاقات کے لئے اِصرار کرتا ہے۔ اور جیسا کہ ہوتا آیا ہے۔ انکار ہی سُنتا ہے۔ پہلا ردِ عمل یہ ہونا چاہیئے تھا کہ شعری شخصیت کسی اِضطراب یا کسی مایوسی کا شکار ہوتی، لیکن اِس کے برعکس اِس شعری شخصیت کا اعتمادِ نفس، غیر متزلزل رہتا ہے اور اِسی اعتمادِ نفس کا نتیجہ ہے کہ اِس ملاقات میں مشاہدۂ حُسن کا یہ محاکاتی شاہکار لہجے کے اِس تیقّن اور کلام کے اِس زور اور گرمی کے ساتھ وجود میں آیا ہے۔ تیسرے شعر کی بنیاد ہمہ اوست کا وہ تصوّر ہے جس سے فارسی شاعری کا ایک معتدبہ حصّہ مالا مال ہے۔ لیکن شعری شخصیت کا اعتمادِ نفس اس فلسفے کے مالہٗ و ماعلیہ پر قانع نہیں تھا۔ اس نے اپنے تدبّر اور فکر سے ہمہ اوست کے بعد ہمہ از اوست کی منزل کو بھی دیکھا اور پھر انسانی خودی کے لاانتہا امکاناتِ ترقی کو بھی جانچا۔ اس کے بعد بڑے اعتماد کے ساتھ اُس نے یہ حکم لگایا کہ آفاق میں بوقلمونی کے جملہ مظاہر میرے ہی مظہرِ ذات ہیں۔ اور جس کی صفات کا میں مظہر ہوں اُس کی بے چگونی اور بے ہمتائی کا تو کہنا ہی کیا ــــ اگلے دو شعر دورِ حاضر کی ناسزائی، اس کی بے اقداری اور شک پرستی پر بھرپور طنز اور محاکمہ ہیں۔ پھر آخری شعر اس ازلی ابدی سفر کا ایک اشاریہ ہے جو صرف سوچنے اور سمجھنے والی شعری شخصیتوں کے لیے ہی اہم ہوا کرتا ہے۔

rekhta

اس حاشیہ فرسائی کا مقصود یہ ہے کہ مندرجہ بالا اشعار میں مضامین کا تنوّع اِتنا ہے کہ ایک شعر، مضمون اور موضوع کے سلسلے میں دوسرے سے نہیں ملتا۔ لیکن موضوع اور اس کے اظہار میں ہر جگہ ایک بات مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ اِن اشعار کی خالق شعری شخصیت کا اعتمادِ نفس جس کی بدولت کلام میں گرمی اور تڑپ، اور بیان میں جزالت پیدا ہوئی ہے، ہر شعر میں بھرپور انداز سے کارفرما ہے۔

اِس مجموعے کی تمام غزلیات موضوع کے اعتبار سے بے حد متنوع ہیں ان میں محاکات اور معاملات سے لے کر خارجی مظاہر کا حُسن، صبح و شام کے مناظر کا کیف، زندگی کے پست و بلند، اور ذات و کائنات پر حکیمانہ افکار تک ملتے ہیں۔ یہ شاعر کی محض گرمیٔ طبع کا کرشمہ نہیں، جو عام زندگی میں طبیعت کا تلوّن کہلاتی ہے۔ بلکہ اس تنوّع کی بنیاد اس نفسیاتی پیچ سے کہیں زیادہ گہری ہے۔ یہ شاعر کے فکر کی ہمہ جوئی اور ہمہ سُوئی ہے۔ کیونکہ یہ تنوّع صرف مضامین اور موضوعات کے انتخاب اور اظہار تک محدود نہیں رہ جاتا، اس کا دامن، شاعر کے اسلوب (بلکہ اسالیب) تک پھیلا ہوا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ (ظاہری معنوں میں) ان غزلیات کے کئی اشعار میں شاعر اتنا روایت پرست نظر آئے گا کہ جنوں کا راستہ روکنے والی بیڑیوں اور مِنّت کے طوقوں تک کا ذکر کرے گا (یہ وہ طوق و سلاسل نہیں جو جدّت پسند شعرا کے ایک طبقے کی مخصوص سیاسی اُپج کی بدولت، چند برس پہلے تک فیشن ایبل مضامینِ غزل بن گئے تھے) اس روایت پرستی کو شاعر نے اسی خلوصِ فکر سے اپنایا

rekhta

ہے جس طرح وہ اپنے دل کے معاملاتِ محبت کا بیان کرتا ہے۔ لیکن اس روایت پرستی کے بعد اُس کے فکر کی ہمہ جُوئی "اسلوبِ اظہار کے دوسرے میدان بھی ڈھونڈتی ہے —— اُوپر دیئے ہوئے اشعار کو ایک بار پھر دیکھئے۔ پہلے شعر کا چشمۂ فیض مومؔن کا شعلۂ آواز والا شعر محض موضوعاً ہی نہیں، اس شعر کا لب و لہجہ، اس کے تیور، اس کے الفاظ کا در و بست، سارے کا سارا مومؔن کا فیضان ہے۔ لیکن شاعر کا اپنا خلوصِ ذات پھر بھی اس میں کارفرما ہے۔ کیونکہ اس شعر کا ماحول مومؔن کے معاشرے کا ماحول نہیں۔ یہ آج کل کی غنائی دُھن کا شعر ہے کیونکہ اس ماحول میں غنا کی تحسین کا والہانہ پن ہے اور بس، اس میں وہ نفس پرستی نہیں جو مومؔن کے شعلۂ آواز والے شعر کا ایک حصہ تھی۔ اسی طرح معاملاتِ دل کے سلسلے میں دوسرا ہی شعر اس مجموعہ کے اشعار کی اس صورت پر ضرور نمائندگی کرتا ہے کہ اس میں حسرؔت کے لہجے کی آب و تاب اور محبت کی معاملہ فہمی کا جادو ہے لیکن اس کا ماحول بھی سراسر جدید معاشرہ ہے۔ حسرؔت کے پردہ پوش ماحول کی چوری چھپے کی کیفیت کے برعکس اِس شعر میں ایک خاص آزادی اور "بے دھڑک پن" ہے —— باقی اشعار میں زندگی کے کوائف اور ذات و کائنات کے مختلف پہلو جس طرح بیان ہوئے ہیں اُن میں وہ لب و لہجہ ملتا ہے جو اقبؔال کی پیمبرانہ سخن سرائی کے بعد ہی اُردو غزل کو مل سکا جس کی لے اگر تیز ہو تو خطابت اور بلند آہنگی بن جاتی ہے۔ اگر ذرا دھیمی ہو تو فراؔق کی آفاقیت، اصؔغر کی معارف نوازی اور فاؔنی کے فلسفۂ غم کوشی کے روپ دھارتی ہے۔

میں نے اپنے مندرجہ بالا معروضات کے سلسلے میں عمداً صفدر صاحب

rekhta

کی غزلیات میں سے انتخاب کردہ اشعار مثالاً درج نہیں کیے بلکہ صرف انھیں اشعار تک اکتفا کی جو ان سطور کا سرنامہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زیادہ مثالیں دینے سے میری بات واضح ہونے کی بجائے بکھر کر رہ جاتی۔ صفدر صاحب کے ہاں مضامین اور اسالیب کا یہ تنوع اتنا زیادہ ہے کہ کہیں سے چار پانچ اشعار اگر مختلف موضوعات پر چھانٹ لیے جائیں تو یہ نکتہ واضح ہو جائے گا کہ اِن غزلیات کا خالق ذہن، اپنی ہمہ جوئی اور ہمہ سُوئی کے لیے قدیم شعری روایت سے لے کر جدید ترین ماحول و معاشرے اور زندگی کے جبلّی اور ہنگامی تقاضوں تک کے میدانوں کا شہسوار ہے۔ کلاسیکی نغمہ طرازی کی دُھن صفدر صاحب کے فکری پس منظر کا اگر غالب رنگ ہے تو اس میں مشاہدے اور تجربے، خیال اور جذبے کی ہم آہنگی نے ایک مخصوص انفرادیت کا رنگ بھی اُجاگر کیا ہے۔ طبع کی جولانی اور جذباتی ماحول کی سازگاری نے اگر معاملاتِ محبت کو اُلجھنے سلجھنے کی رنگا رنگی دکھائی ہے تو سوچنے والے ذہن اور دیکھنے والی آنکھ نے ذات و کائنات کے تقاضوں سے بھی باخبر رکھا ہے۔ زمانے کا لگاؤ اور بناؤ، معاشرتی زندگی کی تگاپوئی، اس میں فرد کے زندگی کرنے کے حیلے اور فرد کے سنورنے کے ہفت خواں' —— یہ تمام بوقلمونیاں مختلف لہجوں اور مختلف ترکیبوں میں ان غزلیات میں دَر آئی ہیں اور اس فنّی جِلا اور سخنوری سے در آئی ہیں کہ شاعر کا یہ دعویٰ محض دعویٰ نہیں حقیقتِ حال ہے۔

آ ہی جائے گا کوئی آبلہ پا میرے بعد
چھوڑے جاتا ہوں وہ کانٹے جو کم آزار سے ہیں

مختار صدیقی

لاہور۔ ۲۳ دسمبر ۶۳ء

فکرِ گاہ گاہ

غزلیاتِ زمانۂ ماضی قریب

۱۹۴۴ء تا ۱۹۶۲ء

rekhta

زیبِ عنوانِ تکلّم ہے وہی اِسمِ جمیل
جس کی خوشبو سے مہکتا ہے دیارِ تخیّل

rekhta

اِک دمِ سرد ہے اَب بادِ صبا میرے بعد
پھیکی پھیکی سی ہے گلشن کی فضا میرے بعد
قدر اے عشق رہے گی تری کیا میرے بعد
کس کو پہنائے گا تو تاجِ وفا میرے بعد
جَورِ نادیدہ سے محروم نہ رکھیے مجھ کو
کس کے کام آئیگی یہ مشقِ جفا میرے بعد
چھوڑے جاتا ہوں وہ کانٹے جو کم آزار سے ہیں
آہی جائے گا کوئی آبلہ پا میرے بعد
سرمۂ چشمِ فسوں گر نہ حنا کی سُرخی
خمِ کاکُل ہے نہ وہ چُست قبا میرے بعد
اُٹھ گیا شیوۂ تسلیم مرے اُٹھتے ہی
لُٹ گیا قافلۂ مہر و وفا میرے بعد
دیکھنا غور سے رُخسارِ حسیں کی زردی
آئینہ تم کو دکھائے گی وفا میرے بعد
کیوں مٹائے کے کم آمیزئ محبوب کا غم
ہے خجل اپنے تغافل پہ حیا میرے بعد
محفلیں عہدِ گذشتہ کی ہوئیں خواب و خیال
کھو گئے اپنے غموں میں رُفقا میرے بعد
مل گیا مجھ کو مرے ذوقِ شہادت کا صلہ
بوئے خوں بانٹتی پھرتی ہے صبا میرے بعد
دلفریب آج بھی ہے آپ کا نقشِ کفِ پا
نہ ہوا سجدۂ بے لوث ادا میرے بعد
میں نہیں ہوں تو بیاباں بھی ہے اِک بزمِ خموش
خامشی ڈھونڈھتی ہے نغمہ سرا میرے بعد
فکرِ آزاد کے بے لاگ تقاضے نہ رہے
یاد کرتا ہے مجھے رہنما میرے بعد

ایک بھی ظرف نہیں بادۂ رنگیں کا حریف   بہکی پھرتی ہے مئے ہوش رُبا میرے بعد

دل کہ تھا زینتِ آرائشِ گیسو صفدرؔ
جب کھُلی زلف تو یہ پھُول گرا میرے بعد

مئی ۱۹۶۲ء

rekhta

○

ہر لحظہ تماشائے دِگر دیکھ رہے ہیں
بنتے ہوئے قطروں کو گہر دیکھ رہے ہیں
تنظیم تری اہلِ نظر دیکھ رہے ہیں
کانٹوں میں نمودِ گلِ تر دیکھ رہے ہیں
چونکی ہیں ابھی نیند میں ڈوبی ہوئی آنکھیں
کھلتے ہوئے میخانے کا در دیکھ رہے ہیں
اب گردِ کفِ پا ہیں دیارِ مہ و انجم
قدسی مری پروازِ نظر دیکھ رہے ہیں
رُخ چھوٹے ہوئے مسکنِ آدم کی طرف ہے
افلاک نشیں عزمِ بشر دیکھ رہے ہیں
چھٹکی ترے مکھڑے کی ہے یہ چاندنی جب سے
ہم شام میں اندازِ سحر دیکھ رہے ہیں
اللہ رے ترے عارضِ تاباں کی تجلّی
دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہے ہیں
ہم اپنے ہی قدموں کی تجلّی کا تماشا
تا منزلِ خورشید و قمر دیکھ رہے ہیں
کچھ لوگ ہوئے شوق سے خود زینتِ آتش
کچھ لوگ تماشائے شرر دیکھ رہے ہیں
ہونٹوں پہ ہنسی آنکھ میں معصوم شرارت
نیرنگِ ادا شام و سحر دیکھ رہے ہیں
اللہ غنی حُسنِ نظر کا یہ کرشمہ
آنکھیں ہیں کدھر اور کدھر دیکھ رہے ہیں
طاقوں سے گرے جاتے ہیں اصنامِ خیالی
ہم بُت شکنی ہائے نظر دیکھ رہے ہیں
اے نبضِ دو عالم تری رفتار میں صفدرؔ
آج اپنے ترانوں کا اثر دیکھ رہے ہیں

اپریل ۱۹۶۲ء

Rekhta

○

برہم ہے نظامِ غمِ دوراں کئی دن سے
برپا ہے تری یاد کا طوفاں کئی دن سے
اِک شوق ہے پھر سلسلہ جنباں کئی دن سے
ہاتھوں میں ہے خود اپنا گریباں کئی دن سے
ارماں ہیں سینے میں غزل خواں کئی دن سے
ہے دیدہ و دل میں کوئی مہماں کئی دن سے
آیا نہیں وہ سروِ خراماں کئی دن سے
سونی ہیں مرے شہر کی گلیاں کئی دن سے
تم جب سے گئے آنکھ کے شعلے نہیں بُجھتے
دل میں بھی مسلسل ہے چراغاں کئی دن سے
نشتر کا طلب گار ہے ہر آبلہ دل کا
خنجر کو پکارے ہے رگِ جاں کئی دن سے
دِل پر تری زُلفوں کی گھٹا جھوم رہی ہے
آنکھوں میں ہے جذبات کا طوفاں کئی دن سے
گُلنار ہوا صحنِ چمن پرتوِ رُخ سے
شعلوں کی لپٹ میں ہے گلستاں کئی دن سے
اِنکار میں اُن کے جو ہے اِقرار کا عالم
ہیں عشق و خرد دست و گریباں کئی دن سے
فریاد یہ کس کی ہوئی ممنونِ سماعت
موتی ہیں ترے کان کے لرزاں کئی دن سے
دل میں لب و رُخسار کے وہ پھول کھلے ہیں
بُجھتا نہیں آنکھوں میں گلستاں کئی دن سے
پونچھے گئے کس دیدۂ خوں بار کے آنسو
گُلگوں ہے ترا گوشۂ داماں کئی دن سے
تاثیر ہے شاید یہ مرے سوزِ دروں کی
آنسو تری پلکوں پہ ہیں لرزاں کئی دن سے

یہ شمع جلائی ہے کس اُمید نے یارب
تابندہ ہے روئے شبِ ہجراں کئی دن سے
تمہید ہے شاید یہ گرفتاریٔ دل کی
زنجیری ہے ذہن میں ہیجاں کئی دن سے

ماتھے پہ نہ چندن ہے نہ آنکھوں میں ہے کاجل
کافر نظر آتا ہے مُسلماں کئی دن سے

۲۳ مارچ ۱۹۶۲ء

rekhta

اہلِ دل کوچۂ اصنام تک آپہنچے ہیں
فاصلے عرصۂ دوگام تک آپہنچے ہیں

جو تہِ خُم ہیں ہو باقی وہی مے دے ساقی
بادہ کش دُردِ تہِ جام تک آپہنچے ہیں

ہوچکے اہلِ یقیں وادیٔ اَوہام میں گُم
اہلِ شک منزلِ الہام تک آپہنچے ہیں

جب خودی کا ہے یہ عالم تو خدا دُور نہیں
بُت شکن محفلِ اَصنام تک آپہنچے ہیں

پھر گئی راہ سے اُمید کی چڑھتی ہوئی دُھوپ
یاس کے سائے در و بام تک آپہنچے ہیں

شوقِ گستاخ ہے اَب پردہ کُشائے اَسرار
خاص جلوے نگہِ عام تک آپہنچے ہیں

میری قسمت کا ستارا تو نہ تھا اتنا بلند
کس کی خاطر وہ لبِ بام تک آپہنچے ہیں

ہم نشینوں کو مُبارک کرمِ خاص ترا
ہم بھی اب رسم و رہِ عام تک آپہنچے ہیں

دیکھئے کس کو یہ اعزازِ خصوصی ہو نصیب
لب ترے منزلِ دُشنام تک آپہنچے ہیں

کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ ترے دیوانے
تیری دُھن میں ترے ہمنام تک آپہنچے ہیں

راہ پر اُن کو لگا لایا دُعاؤں کا خلوص
صبح بھٹکے تھے مگر شام تک آپہنچے ہیں

ہائے وہ لوگ جو ہوں لذّتِ آغاز میں گُم
وائے وہ لوگ جو انجام تک آپہنچے ہیں

میری نظریں گُل و گلزار سے آگے نہ بڑھیں
تیرے جلوے سحر و شام تک آپہنچے ہیں

قطعہ

حلقۂ زلفِ گرہ گیر کے کچھ زندانی
حلقۂ گردشِ ایّام تک آ پہنچے ہیں

دیکھیں یہ سلسلۂ شوق کہاں پر ٹوٹے
صیدِ اُس دام کے اِس دام تک آ پہنچے ہیں

سہ سکے دھوپ نہ صحرائے جنوں کی صفدرؔ
سایۂ زلفِ سیہ فام تک آ پہنچے ہیں

۲۵ دسمبر ۱۹۶۱ء

برپا ہوا سینے میں یہاں ماتمِ غم اور
اُٹھے ہیں تری یاد میں آہوں کے علم اور
اِن زُہرہ جبینوں نے کئے جتنے ستم اور
بڑھتا ہی رہا میری محبت کا قدم اور
مائل ہیں تو کیا اب بھی وہ اِک آفتِ جاں ہیں
کھنچ جائیں تو بن جائیں گے تصویرِ ستم اور
انداز یہ کہتا ہے کوئی ہم سے خفا ہے
دل پھر بھی یہ کہتا ہے کہ وہ اَور نہ ہم اور
اِک کیف کا عالم ہے تپش ہے نہ خلش ہے
بخشا ہے تری یاد نے پیرایۂ غم اور
آسانیاں خود راہزنِ ذوقِ طلب ہیں
دشواریاں حائل ہوں تو بڑھتے ہیں قدم اور
اچھی نہیں اَے شوق یہ آشفتہ بیانی
اُس کاکُلِ شب رنگ میں پڑ جائیں گے خم اور
رُسوائی کو کیا کم تھیں محبت کی نگاہیں
اب تیرے تغافل سے بڑھا حُسنِ ستم اور
مہرِ مہ و انجم تو فقط گردِ سفر ہیں
تاریخ بنائیں گے مرے نقشِ قدم اور
ہر شوق فسانہ ہے مری کم نظری کا
ہر آہ یہ کھلتا ہے مرے دل کا بھرم اور
تھا جلوۂ نیرنگ جو مقصودِ تجلّی
ہر گوشۂ دل میں ہوئے تعمیر حرم اور
تسکینِ جبیں ہو نہ سکی ایک خدا سے
بیتابیٔ طاعت نے تراشے صنم اور
اے جانِ حیا تجھ کو قسم اپنی حیا کی
رکھ لے کوئی دن میری محبّت کا بھرم اور

اللہ کرے سچ ہو یہ افواہِ محبت کھائی ہے کسی شوخ نے کچھ دل میں قسم اور
پہچان نشان رہبری و راہ زنی کے یہ نقشِ قدم اور ہیں وہ نقشِ قدم اور

مقصودِ بیاں ایک مگر فرق ہے صفدرؔ
واعظ کا قلم اور ہے شاعر کا قلم اور

۱۷؍ دسمبر ۱۹۶۱ء

سلیقے عشق کے تم نے سکھائے ہیں کیا کیا
نظر سے حوصلۂ دل بڑھائے ہیں کیا کیا

تری ادائے تغافل نے جن کو توڑ دیا
”مِری“ میں یاد وہ پیمان آئے ہیں کیا کیا

ہر اک نقاب سے ٹکرائیں مضطرب نظریں
فریب ذوقِ تجسّس نے کھائے ہیں کیا کیا

جلا دیئے تھے سرِ یادِ نقشِ پا نے چراغ
حجاب ماہ و ثُریّا کو آئے ہیں کیا کیا

چھُڑا کے دستِ تمنّا سے اپنا دامنِ ناز
وہ بے بسی پہ مری مُسکرائے ہیں کیا کیا

حضورِ دوست زباں پر جو ذکرِ غیر آیا
مرے خلوص پہ وہم اُن کو آئے ہیں کیا کیا

فروغِ عارضِ تاباں سے کل گلستاں میں
چراغِ لالہ و گُل جھلملائے ہیں کیا کیا

نظر اُٹھی کبھی سہواً جو ماسوا کی طرف
ترے خیال نے زانو دبائے ہیں کیا کیا

پڑی ہے جب بھی نظر چاکِ جیب و داماں پہ
خود اپنے حال پہ ہم مُسکرائے ہیں کیا کیا

مری غزل میں حسینوں کا تذکرہ سُن کر
خطوطِ غم ترے چہرے پہ آئے ہیں کیا کیا

تمہارے رُخ پہ اُداسی کی اِک جھلک پا کر
دِیئے اُمید کے دل نے جلائے ہیں کیا کیا

ستم نواز کو جب مائلِ کرم پایا
دِلوں کے بھید زبانوں پہ آئے ہیں کیا کیا

یہ انکشاف نہ اُن پر کہیں گراں گزرے
کہ ہم نے داغ زمانے کے کھائے ہیں کیا کیا

مرا جنونِ محبت ہے بے رُخی کا سبب
اِسی خیال سے آنسو بھر آئے ہیں کیا کیا

نظر فسردہ و دل خستہ و جبیں گمراہ
تری نقاب نے فتنے اُٹھائے ہیں کیا کیا

ہمارا نقشِ قدم دیکھتی چلے دُنیا
چراغ راہ میں ہم نے جلائے ہیں کیا کیا

اُنھیں پسند جو آیا مرا بیاں صفدؔر
خطوط ہمنفسوں کو سُنائے ہیں کیا کیا

یکم جولائی ۱۹۵۱ء

rekhta

وہ تبسّم جو لبِ حُسن کی جاگیر میں ہے
اُس کی تنویر کا حصّہ مری تقدیر میں ہے

برہمی جب سے تری زُلفِ گرہ گیر میں ہے
دل سمجھتا ہے کہ اُلجھن مری تقدیر میں ہے

اُن کی بیگانہ نگاہی سے فسردہ نہیں دل
وہ جو اِک گرمیٔ جذبات تھی تقریر میں ہے

پڑھ لیے دل نے تری چینِ جبیں کے انداز
میری قسمت کا لکھا بھی اسی تحریر میں ہے

لب پہ فریاد کبھی آئی ہے تو شرمائی ہوئی
خود اِک احساسِ ندامت مری تقصیر میں ہے

ہر نفس تازہ عناصر ہیں برافگندہ نقاب
کائنات آج مرے حلقۂ تسخیر میں ہے

اب نہ وہ دل ہے نہ وہ دل میں تمنّا کا خروش
دلکشی آج بھی لیکن تری تصویر میں ہے

رنجِ بیچارگیٔ جذبۂ اصلاح نہ پوچھ
کہ فسادِ ازلی خلقتِ تعمیر میں ہے

کتنی دلچسپ ہے یہ سلسلہ جنبانی بھی
کہ تری زلف کا خم حلقۂ زنجیر میں ہے

کیوں کوئی آئے مٹانے کو مجھے اے صفدرؔ
خود ہی تخریب کا پہلو مری تعمیر میں ہے

اپریل ۱۹۴۷ء

جھک گئی گردن وفا کی وہ مقام آ ہی گیا
عقل منہ تکتی رہی اور عشق کام آ ہی گیا

وقت جب آیا تو جذبِ شوق کام آ ہی گیا
میرے نالے سُن کے وہ بالائے بام آ ہی گیا

اللہ اللہ شدّتِ ذوقِ طلب کا معجزہ
جان کھنچ کر لب پہ جب آئی تو جام آ ہی گیا

اضطرابِ شوق کی خانہ خرابی دیکھئے
بے ارادہ آج لب پر اُن کا نام آ ہی گیا

مدّتوں کیں دل سے باتیں پیکرِ تخئیل نے
رفتہ رفتہ اُن کا اندازِ کلام آ ہی گیا

جسکے قدموں کی دھمک سے خاک بن جاتی ہے پھول
مژدہ اے رندو کہ وہ جادو خرام آ ہی گیا

ہلکی ہلکی مسکراہٹ کی حسیں لہروں کے ساتھ
آج اُن نازک لبوں پر میرا نام آ ہی گیا

گوشہ گوشہ بن گیا اِک محشرستانِ ظہور
دل کے آئینہ میں وہ ماہِ تمام آ ہی گیا

اُٹھ گیا انساں کے دل سے بندہ و آقا کا فرق
آدمی کو آدمی کا احترام آ ہی گیا

دل کو دل سے رابطہ ہو یہ ہوا مفہومِ عشق
ہم اِدھر روٹھے اُدھر اُن کا پیام آ ہی گیا

دن کو دُنیا کے بکھیڑے رات کو اُنکا خیال
صبح کا بھٹکا مسافر وقتِ شام آ ہی گیا

وہ رہے بیزار ہم کیوں نازِ بے جا کھینچتے
دل کی خودداری میں رنگِ انتقام آ ہی گیا

تھے کہیں تسبیح کے پھندے کہیں زلفوں کے دام
طائرِ آزاد صفدؔر زیرِ دام آ ہی گیا

دسمبر ۱۹۴۴ء

کیا جذبِ شوقِ چشمِ حقیقت نگر میں ہے
جو کچھ پسِ حجاب ہے وہ بھی نظر میں ہے

زیر و زبر ہے شمس، تو ہلچل قمر میں ہے
تسخیرِ کائنات نگاہِ بشر میں ہے

تا دور اِک جھلک سی ہماری نظر میں ہے
شاید فلک پہ اُن کی تجلّی سفر میں ہے

کعبہ کی راہ ہو کہ کلیسا کی راہ ہو
جو پاؤں اُٹھ گیا وہ تری رہ گذر میں ہے

آئینہ بھی نہ دیکھ سکا جس کو آج تک
ایسا بھی ایک عکس تمہارا نظر میں ہے

ہر سانس ایک گام ہے ہر لمحہ اِک سفر
منزل تھکن کا نام ہے دنیا سفر میں ہے

آرائشِ جمالِ جہاں تاب کی قسم
میرے جگر کا خون بھی رنگِ سحر میں ہے

منزل ہے اپنی عالمِ سود و زیاں سے دور
انساں ہنوز مرحلۂ خیر و شر میں ہے

خونِ دل و جگر کا صلہ دے رہا ہے آج
یہ رنگِ انفعال جو تیری نظر میں ہے

میرا سرِ نیاز کبھی خم نہ ہو سکا
کیسے کہوں کہ جذب ترے سنگِ در میں ہے

شاید کسی غریب کی تقدیر جاگ اُٹھی
اِک رحم کی جھلک جو تمہاری نظر میں ہے

تم کائنات اور تمہیں جانِ کائنات
تم ہو تو کائنات ہماری نظر میں ہے

دل کانپ کانپ اُٹھتا ہے منزل کے نام سے
صفدر کوئی فریب دلِ راہبر میں ہے

اکتوبر ۱۹۴۴ء

رخِ رنگیں پہ اشکوں کی روانی اب بھی ہوتی ہے
سنا ہے مجھ پہ انکی مہربانی اب بھی ہوتی ہے

سکوتِ عشق اظہارِ تمنا اب بھی کرتا ہے
نگاہِ ناز صرفِ لنترانی اب بھی ہوتی ہے

تغافل نے کسی کے کر دیا بیزار جینے سے
مگر امید وجہِ زندگانی اب بھی ہوتی ہے

ستارے بے پلک جھپکائے سنتے ہیں یہ افسانہ
لبِ مہتاب پر تری کہانی اب بھی ہوتی ہے

بہاروں کو جو لوٹے وہ جوانی اب نہ ہو لیکن
بہاریں جسکو لوٹیں وہ جوانی اب بھی ہوتی ہے

یہ مانا رازِ دل کہہ کر دل اپنا کر لیا ہلکا
مگر محسوس اُن کی سرگرانی اب بھی ہوتی ہے

ترے وعدے بدل سکتے نہیں میری طبیعت کو
ترے وعدوں پہ اکثر بدگمانی اب بھی ہوتی ہے

امیدیں ہیں چراغِ رہگذر ان کا بھروسہ کیا
بسر تاریکیوں میں زندگانی اب بھی ہوتی ہے

سمجھتے تھے جو آنکھوں کی زباں وہ اب کہاں لیکن
نگاہوں سے دلوں کی ترجمانی اب بھی ہوتی ہے

جسے سنتے تھے ہم چاند کی ٹھنڈی شعاعوں میں
ستاروں کی زباں پر وہ کہانی اب بھی ہوتی ہے

ہوئی مدت کہ زخمِ آرزو مرجھا گئے لیکن
مری صورت ترے غم کی نشانی اب بھی ہوتی ہے

چمن والوں کے آدابِ جنوں کا معجزہ کہئے
کہ دامانِ خزاں سے گل فشانی اب بھی ہوتی ہے

بہت کچھ دے چکی ہے زندگی کو اسکا حق دنیا
مگر بے کیف مفلس کی جوانی اب بھی ہوتی ہے

مرے اشکوں سے صفدر اب بھی بھر جاتا ہے جام اپنا
بغیر ان کے مئے گلرنگ پانی اب بھی ہوتی ہے

ستمبر ۱۹۴۴ء

اَب بھی وہ مقدمِ صاحب نظراں ہے کہ جو تھا
ذرہ ذرہ مری جانب نگراں ہے کہ جو تھا

جلوۂ دوست قریبِ رگِ جاں ہے کہ جو تھا
پھر بھی دُوری کا مرے دل کو گماں ہے کہ جو تھا

دل مرا محوِ رُخِ ماہ وشاں ہے کہ جو تھا
تیری تصویر کا ہر بت پہ گماں ہے کہ جو تھا

لَو لگی ہو تو نہیں دیر و حرم میں کوئی فرق
بانگِ ناقوس میں اندازِ اذاں ہے کہ جو تھا

وصل کی رات ہو یا شامِ جدائی کی سحر
میری نظروں میں سبک خوابِ گراں ہے کہ جو تھا

ذہن کے طاق میں روشن ہیں اُمیدوں کے چراغ
بزمِ ہستی میں وہی آج دھواں ہے کہ جو تھا

یہ الگ بات کہ ہاتھ آئے نہ لیلائے جمال
ہر بگولا کسی محمل کا نشاں ہے کہ جو تھا

میرے آنسو نہ تھمے اُن کا تبسم نہ رُکا
شبنم و گل میں وہی ربطِ نہاں ہے کہ جو تھا

اَسے نہ ہے جذبۂ تخلیق دہوائے ایجاد
اب بھی خوش رنگ جہانِ گزراں ہے کہ جو تھا

حُسن روپوش ہے اور دید کے آثار نہیں
پھر بھی ہنگامہ بہر کوئے بتاں ہے کہ جو تھا

مجھ پہ لگتی ہے اگر دید کی تہمت لگ جائے
یہ نہ ہو شوق کا عالم وہ کہاں ہے کہ جو تھا

دل کو نومیدیٔ جاوید سے تسکیں نہ ہوئی
ہجر کا بار طبیعت پہ گراں ہے کہ جو تھا

کب سے شیرازۂ جذبات ہے برہم صفیؔ
پھر بھی وہ سلسلۂ حُسنِ بیاں ہے کہ جو تھا

جولائی ۱۹۴۴ء

کاوشِ پیہم

غزلیاتِ زمانۂ ماضی بعید

۱۹۳۲ء تا ۱۹۴۴ء

rekhta

نظر آیا تھا جن تنکوں میں خوابِ آشیاں برسوں

اُنھیں کو لے کے گھوما کیں فضا میں آندھیاں برسوں

تھوڑا سا کیف لے کے تمہاری نگاہ سے
آگے ہے شوق قافلۂ مہر و ماہ سے

وہ ضبطِ غم کا حوصلۂ مستقل کہاں
عادت بدل گئی کرمِ گاہ گاہ سے

اَفسانۂ کلیم بڑی بات تو نہیں
جب چاہیں آپ آگ لگا دیں نگاہ سے

اَفلاک پر ستاروں کی افشاں بکھر گئی
نکلی تھی اِک شعاع تری جلوہ گاہ سے

میرا گلہ نہ کیجیے اپنے کو ایک دن
آئینہ لے کے دیکھیے میری نگاہ سے

اے عقل تیری راہ میں آسانیاں سہی
اپنا سفر مگر ہے محبت کی راہ سے

ہونے لگی ہے ہوش میں دیوانگی شریک
کیا چیز بن چلا ہوں تمہاری نگاہ سے

گو ڈال دی غرور نے چلمن عتاب کی
شوخی مگر رُکی نہ اَدا و نگاہ سے

جُھکتی نہیں ہے اب کسی دَر پر جبینِ شوق
اِذنِ سجود پا کے تری بارگاہ سے

نازاں ہے حُسن شعبدۂ آب و رنگ پر
ہے بے خبر کرشمۂ ذوقِ نگاہ سے

یہ سجدۂ وفا ہے نمازِ حرم نہیں
اِک بار جُھک کے پھر نہ اُٹھا سجدہ گاہ سے

مایوسیٔ نظر سے سُنائے ہیں رازِ عشق
اکثر زباں کا کام لیا ہے نگاہ سے

نازاں ہے شیخ پاکیٔ دامانِ زُہد پر
واقف نہیں ہے عظمتِ ذوقِ گناہ سے

سلجھاؤں لاؤ شیخ و برہمن کی کشمکش رشتے ملاؤں اِن کے تمہاری نگاہ سے
دُنیا ہمیں بھی لا کے رہی اپنی راہ پر ہم بچ کے لاکھ بار چلے اسکی راہ سے

رسوائیوں کے خوف سے لب بند ہیں مگر
صفدؔ تمہیں پکار رہا ہے نگاہ ہے

جنوری ۱۹۴۰ء

یہ کس کے لب ہیں زمزمہ پرداز دیکھنا
رقصاں ہے دل میں شعلۂ آواز دیکھنا
وصفِ زباں میں ذہن کی پرواز دیکھنا
کیا کیا کھلیں گے جوہرِ اعجاز دیکھنا
محفل کا رنگ بھی بتِ طنّاز دیکھنا
کچھ کہہ نہ جائے چشمِ فسوں ساز دیکھنا
بدلی ہوئی ہے کیوں مری آواز دیکھنا
چھیڑا ہے کس نے دل کا مرے ساز دیکھنا
مدّت کے بعد آج پھر اُن کی نگاہِ لُطف
دُہرا رہی ہے صورتِ آغاز دیکھنا
انگڑائی لی تھی آئینہ پر جا پڑی نظر
تصویر بن کے رہ گئے انداز دیکھنا
پرچھائیوں کا اس سے تعاقب نہ ہو سکا
بے چارگیٔ فکرِ سخن ساز دیکھنا
انجامِ کار اُن کی توجہ کے فیض سے
روشن ہے کتنا چہرۂ آغاز دیکھنا
آنکھیں کہیں کبھی کچھ تو نہیں اُن کا اعتبار
ہونٹوں پہ آ نہ جائے کہیں راز دیکھنا
جنبش حریمِ ناز کے پردوں کو ہو چلی
میری نگاہِ شوق کا اعجاز دیکھنا
دل کو فریبِ دیر و حرم سے ملی نجات
راس آیا ابروئے بُتِ طنّاز دیکھنا
کہتے نہ تھے کہ شوق کو اِتنی سزا نہ دو
تنگ آ کے دل نے کھول دیا راز دیکھنا

صفیؔ ابھی تصورِ انجام ہے غلط
دُھندلا رہا ہے چہرۂ آغاز دیکھنا

نومبر ۱۹۴۰ء

نظر میں رہتی ہے آواز میں پائی نہیں جاتی
تمنا وہ ہے جو الفاظ میں لائی نہیں جاتی

تری زلفوں کا سودا جس کو چُن لے اُسکی خوش بختی
یہ وہ ناگن ہے جو ہر دل پہ لہرائی نہیں جاتی

محبت مشربِ اہلِ وفا میں سر کی بازی ہے
پلک تلوار کے سائے میں جھپکائی نہیں جاتی

کرشمے عقل کے پھیلے ہیں فرش سے ستاروں تک
مگر پھر بھی جنوں کی کارفرمائی نہیں جاتی

سُنے دُنیا ترے قدموں کی آہٹ دل کی دھڑکن سے
یہ وہ دُھن ہے کہ جو ہر ساز پر گائی نہیں جاتی

خوشا دردِ محبت ہر خلش جس کی حیات افزا
وہ کیسے دل ہیں جن سے چوٹ یہ کھائی نہیں جاتی

اُمیدیں شوق کو جب تک نہ تھوڑا سا سہارا دیں
جبیں یوں ہی کسی کے در سے ٹکرائی نہیں جاتی

جوانی وہ حسین شے ہے کہ جا کر پھر نہیں آتی
یہ وہ دلکش کہانی ہے جو دہرائی نہیں جاتی

تصور منفعل ہے اور بصیرت سر بہ زانو ہے
تری تصویر میں تیری ادا پائی نہیں جاتی

حقیقت آپ ہی اپنے کو سمجھا دے تو سمجھا دے
ہماری آپکی کوشش سے سمجھائی نہیں جاتی

ترے فرقت کے ماروں کی تسلی کس سے ممکن ہے
طبیعت خود بہل جاتی ہے بہلائی نہیں جاتی

محبت درحقیقت اک خدا کا راز ہے صفدر
یہ وہ گُتھی ہے جو منطق سے سلجھائی نہیں جاتی

اکتوبر ۱۹۴۰ء

جنونِ بے خودی کے ساتھ اَسرارِ خودی سمجھے
وہی سمجھے اِسے جو موت کو بھی زندگی سمجھے

مُزیّن ہے انھیں تبدیلیوں سے زندگی سمجھے
مصیبت بھی اگر آئی تو تمہیدِ خوشی سمجھے

مبارک وہ اندھیرا جس میں دو دل اِک جگہ دھڑکیں
مبارک وہ اندھیرا عشق جس کو روشنی سمجھے

کسی کے ساتھ وہ دلکش شفق وہ چاندنی راتیں
ہم اِن کو حاصلِ شب ہائے تارِ زندگی سمجھے

نہ تھا معلوم یہ آنسو کسی دن رنگ لائیں گے
چمن والے مرے رونے کو برسوں تک ہنسی سمجھے

جوانی کی اُمنگیں مشعلیں لے لے کے اُٹھی تھیں
اِرادے ہر اندھیری رات کو بھی چاندنی سمجھے

رہا جب تک کسی کی اِک نظر کا آسرا باقی
فریبِ لُطف کی آویزشوں کو زندگی سمجھے

محبت اِک جنوں ہے اور جنوں آداب کیا جانے
محبت کو شریعت بے نیازِ بندگی سمجھے

مزاج اس عشق کا سمجھے گا کون اے نازِ محبوبی
تری چشمِ تغافل کو جو وجہِ زندگی سمجھے

جو پی جاتی ہے آنکھوں سے خودی اُس مے کو کیا جانے
بڑی مشکل سے اہلِ لذ میری بیخودی سمجھے

میں اب غم خانۂ ہستی کے سب پردے اُٹھاتا ہوں
جگا دو اُن کو جو اب تک نہ رازِ زندگی سمجھے

یہ اِک جذبے کی سرشاری ہے محویت نہیں صفدرؔ
یہ مستی ہے خودی کی کون اس کو بیخودی سمجھے

ستمبر ۱۹۴۰ء

Rekhta

پرتو کسی کا دیکھ کے چشمِ پُر آب میں
تصویر بن گیا ہوں شبِ ماہتاب میں

تم سر سے لے کے پاؤں تلک اک موجِ رنگ ہو
حل ہو گئی بہار تمہارے شباب میں

پردہ اٹھا تو بن کے قیامت بکھر گئیں
وہ شوخیاں جو قید تھیں بندِ نقاب میں

چھٹکی ہوئی ہے اُن کے تبسّم کی چاندنی
پھر جان پڑ گئی ہے شبِ ماہتاب میں

یاں مرتعش لبوں پہ مرے داستانِ شوق
واں رنگ التفات کا ہے اجتناب میں

جیسے کہ ہم خفا ہیں منانے وہ آئے ہیں
سو بار اس خیال سے بہلے ہیں خواب میں

ہر چند ہے چھٹی ہوئی چلمن شعاع کی
چہرہ جھلک رہا ہے مگر آفتاب میں

وہ کھنچ گئے تو چاندنی سنسان ہو گئی
وہ مل گئے تو نور بڑھا ماہتاب میں

میرے سوالِ شوق نے شعلوں کو دی ہوا
عارض کے پھول سُرخ ہوئے پیچ و تاب میں

دنیا بدل گئی تو گِلہ کیا ہے دوستو
تم بھی تو وہ نہیں رہے اِس انقلاب میں

اب دیر کیا ہے عارضِ روشن طلوع ہو
سورج کا عکس ڈوب چکا ہے چناب میں

اِک گونہ بیخودی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ
کچھ رنگِ آگہی بھی ہے کیفِ شراب میں

اے عشق تیرے فیض سے ہم نے یہ زندگی
ہنس ہنس کے کاٹ دی ہے جہانِ خراب میں

Rekhta

الے جُھک کے ذرا یہ بھی دیکھ لے کس کس کا خون ہے ترے

صفدرؔ یہ شعر جن میں ہے عکسِ رُخِ حبیب
چمکیں گے دامنِ نگہِ انتخاب میں

مارچ ۱۹۸۰ء

نغمے تخیلات کے برسا رہا ہوں میں
محفل پہ بوئے گُل کی طرح چھا رہا ہوں میں

دیکھیں نہ تیرے جذبۂ رحمت کی وسعتیں
کوتاہیٔ خیال پہ شرما رہا ہوں میں

دل نے حجاب رُخ سے اُٹھایا تھا ایک بار
اب تک اُسی گناہ پہ پچھتا رہا ہوں میں

چھینٹوں سے خونِ شوق کے دامن ہے گلکدہ
رنگینیٔ بہار کو شرما رہا ہوں میں

آنکھوں میں میری جھوم رہا ہے ترا جمال
خود جلوہ گاہِ ناز بنا جا رہا ہوں میں

یادش بخیر آپ کا وہ عہدِ التفات
دل کو اُسی خیال سے بہلا رہا ہوں میں

کل شام کو جو آپ کی آنکھوں سے بہہ گئے
اُن آنسوؤں کے ساتھ بہا جا رہا ہوں میں

کچھ چیز ہے جو کھینچ رہی ہے نگاہ کو
کچھ بات ہے جو اُن کا ہوا جا رہا ہوں میں

یارب مری بلند نگاہی کہاں گئی
کن پستیوں کی سمت گرا جا رہا ہوں میں

دل میں جمالِ دوست کا پَرتو لئے ہوئے
ہر ماہتاب حُسن کو شرما رہا ہوں میں

صفدر کسی کے نیم تبسم کے سامنے
سو جنتیں نگاہ کی ٹھکرا رہا ہوں میں

فروری ۱۹۴۰ء

rekhta

چھیڑ وہ راگ کہ جذبات ہیں طوفاں ہو جائے
دل کا ہر ذرۂ بیتاب غزل خواں ہو جائے

عشق وہ شعلۂ بیباک ہے وہ جذبۂ تُند
لاکھ پردوں میں بھی رکھّو تو نمایاں ہو جائے

غم کی کوشش ہے کہ چھپے کو بیاباں کردوں
اشک کہتے ہیں کہ دامن بھی گلستاں ہو جائے

یہی منشا ہے مسلسل تری انگڑائی کا
کہ یہ شیرازۂ کونین پریشاں ہو جائے

عقل نے بیچ سے سرکا دیئے سارے پردے
عشق اب الجھ کے نقابِ رُخِ جاناں ہو جائے

زندگی کیا کہیں شعلہ کہیں بجلی کہیں موج
یہی بیتابیاں مل جائیں تو انساں ہو جائے

اُن کی نظریں جو مرے زخمِ جگر کو چھُو جائیں
تو یہی پھول تمنّائے گلستاں ہو جائے

نگہِ شوق سلامت یہ حجابات ہیں کیا
لاکھ پردوں میں چھپے حُسن تو عریاں ہو جائے

اُف وہ نظریں جو ندامت سے جھکی جاتی ہیں
ہائے وہ دل جو گلہ کرکے پشیماں ہو جائے

تجھ کو پلکوں پہ لرزتے ہوئے تاروں کی قسم
یوں نہ شرما کہ محبت بھی پشیماں ہو جائے

ہم نے اس دل کو چراغوں سے سجا رکھا ہے
کہ تصوّر ترا شاید کبھی مہماں ہو جائے

سینۂ حضرتِ انساں ہو کہ قلبِ ملکوت
تم جس آئینہ کو دیکھو وہی حیراں ہو جائے

نظر اُن کی جو ہے تاثیر میں مرہم صفدؔر
ابھی تیور جو بدل جائیں تو پیکاں ہو جائے

جنوری ۔۴۰ ۱۹ء

دل کے ہر ذرّے کو مجبورِ تمنّا کر دیا
اے نگاہِ لُطف یہ کیا حشر برپا کر دیا

آج اے بیتابیٔ دل تو نے یہ کیا کر دیا
اک تماشا آفریں کو خود تماشا کر دیا

کچھ نہ کام آئی محبت میں ہماری احتیاط
اُن کی نظروں نے خود اپنا راز افشا کر دیا

ہم سے پہلے تھی خدا کی یہ زمیں اک مشتِ خاک
ہم نے وسعت دے کے ہر ذرّے کو دنیا کر دیا

خود ہی اِک درماں تھا محرومیِ درماں کا ملال
رفتہ رفتہ اک مریضِ غم کو اچھا کر دیا

اے تصور اللہ اللہ جلوہ سامانی تری
جس جگہ نظریں جما دیں جلوہ پیدا کر دیا

میں نے ہر صورت سے روکا اضطرابِ شوق کو
ہر نظر نے خود زباں بن کر تقاضا کر دیا

اُس نے پہلے عشق کی فطرت کو بخشا اضطراب
اور پھر خاموش رہنے کا اِشارا کر دیا

دیکھ اے دل توڑنے والے مری ہمت کو دیکھ
میں نے آوازِ شکستِ دل کو نغمہ کر دیا

تم سے کیا اس بات کا شکوہ کہ تم میرے نہیں
کیا کہیں اُس کو مجھے جس نے تمہارا کر دیا

اُن کی آنکھوں میں ہیں آنسو اُن کے ہونٹوں پہ ہے آہ
بے قراری نے مری اللہ یہ کیا کر دیا

کچھ مری بیتابیوں سے کھُل گئے اَسرارِ عشق
کچھ تغافل نے ترے یہ راز افشا کر دیا

دیکھ لوں گا اُن کی چشمِ ناز کی خود داریاں
دردِ دل نے گر تڑپنے کا اشارا کر دیا

عشق جس در پر جھکا اُس در پہ دنیا جھک گئی   اس کو کعبہ کر دیا اُس کو کلیسا کر دیا
پرتوِ رخ نے دیا پردے کو بھی جلوے کا رنگ   دیدۂ حیراں نے جلوے کو بھی پردا کر دیا

اُس نگاہِ لطف کا صفدرؔ ادا کر شکریہ
جس نے دل کو محشرستانِ تمنا کر دیا

جنوری ۱۹۴۰ء

rekhta

گُل و نسریں میں چھپ کر بھی پَرافشانی نہیں جاتی
کوئی پردہ ہو اُن کی جلوہ سامانی نہیں جاتی
تمہارے حُسن کی آشوب سامانی نہیں جاتی
بدل دی یوں مری حالت کہ پہچانی نہیں جاتی
مری آشفتہ حالی کا تماشہ دیکھنے والے
تری معجز نگاہی تجھ سے پہچانی نہیں جاتی
یہ کس نے رہ گزر میں جا بجا جلوے لٹائے ہیں
ستاروں کی چمک ذرّوں کی تابانی نہیں جاتی
میں آخر جان کیوں دوں فصلِ گُل کی بے ثباتی پر
وہ جاتی ہے تو جائے دل کی ویرانی نہیں جاتی
مآلِ خندہ سے واقف ہے لیکن اس کو کیا کہئے
کلی کی آرزوئے چاک دامانی نہیں جاتی
مرے سجدوں کی منزل ہے حدودِ راہ سے آگے
کسی نقشِ قدم تک میری پیشانی نہیں جاتی
پڑی ہے چھوٹ شاید اُن پہ تیرے روئے تاباں کی
فروغِ دیدۂ انجم کی تابانی نہیں جاتی
جنوں میرا گریباں چاک کر دے پھر کہ محشر میں
مری صورت کسی سے آج پہچانی نہیں جاتی
خدا کی شان ہے دعویٰ انہیں منزل شناسی کا
مری گردِ قدم تک جن سے پہچانی نہیں جاتی

مری آنکھوں نے صفدر خود تماشہ بن کے دیکھا ہے
کسی پہلو سے اُن کی جلوہ سامانی نہیں جاتی

دسمبر ۱۹۳۹ء

یہاں موجود ہیں قطروں میں طوفاں دیکھنے والے
رگِ ہر خار میں خونِ گلستاں دیکھنے والے

تماشائے جنوں اِک مستقل تاثیر رکھتا ہے
گریباں چاک ہیں میرا گریباں دیکھنے والے

یہ کون آیا ہے اپنے روئے تاباں میں سحر لے کر
نگاہیں تو اُٹھا لے شامِ ہجراں دیکھنے والے

نظر گُل کار ہے تیری بساطِ دل کو وسعت دے
گُلوں کی حد نہیں تنگیِٔ داماں دیکھنے والے

اُٹھا کر آئینہ دیکھیں شکستِ رنگ کا منظر
تماشا بن چلے ہیں روئے جاناں دیکھنے والے

مرا جوشِ جنوں ہے معجزہ اُن کی نگاہوں کا
نہ ہوں حیراں مرا چاکِ گریباں دیکھنے والے

بہ نازِ منفعل کب تک خبر لے اپنی زلفوں کی
مری جمعیتِ خاطر پریشاں دیکھنے والے

طلب کرتی ہے اپنا قرض تجھ سے اُسکی ویرانی
بیاباں کا بھی کچھ حق ہے گلستاں دیکھنے والے

دِلِ مجبور کو مایوسیاں جب گھیر لیتی ہیں
خدا کو یاد کر لیتے ہیں طوفاں دیکھنے والے

ترِی ہمّت نہ ٹوٹے ناؤ ٹوٹی ہے تو کیا پروا
اُٹھا پتوار اپنی جوششِ طوفاں دیکھنے والے

جنوں کا سایہ اب تو زہد کے دامن تک آ پہنچا
ادھر دیکھیں مرا چاکِ گریباں دیکھنے والے

یہی خوشبو کے جھونکے ذہن تک پہنچے تو کیا ہوگا
سنبھل جائیں بہارِ کوئے جاناں دیکھنے والے

میں دل کے منتشر ٹکڑوں کو پھر ترتیب دے لوں گا
نہ گھبرائیں مرا حالِ پریشاں دیکھنے والے

تبسم زیرِ لب وہ بے نقاب آتے ہیں محشر میں   انھیں پہچان لیں میرا گریباں دیکھنے والے

سمٹ آئی ہے صفدرؔ درد کی دنیا نگاہوں میں
مجھے دیکھیں مآلِ شامِ ہجراں دیکھنے والے

اکتوبر ۱۹۳۹ء

rekhta

سنبھل چلا دلِ بے اختیار کیا کہنا
تبسّمِ نگہِ لطفِ یار کیا کہنا

نہ لطف کو نہ ستم کو قرار کیا کہنا
مزاجِ حسن کے پروردگار کیا کہنا

تری نگاہِ کرم کی تبسم وہ پہلی نظر
حیاتِ عشق میں ہے یادگار کیا کہنا

بڑی ادا سے ہوا تحفۂ نیاز قبول
بڑھا دیا ہے مرا اعتبار کیا کہنا

اٹھا دیئے ہیں تصور نے بیچ کے پردے
نظر کے سامنے ہے روئے یار کیا کہنا

تبسمِ نگہِ فتنہ زا نے چھین لیا
بہ یک نظر مرا صبر و قرار کیا کہنا

کسی کے گیسوئے عنبر فشاں کی خوشبو سے
نہا کے آئی ہے فصلِ بہار کیا کہنا

جگر کے داغ تک اتری جو لو تبسم کی
لہک اٹھا یہ مرا لالہ زار کیا کہنا

دمِ وداع متاعِ سفر ہیں میرے لئے
وہ اشک وہ گہرِ آبدار کیا کہنا

چھپا رہا مری آنکھوں میں پتلیوں کی طرح
کھلا نہ رازِ مرے پردہ دار کیا کہنا

تری امیدِ کرم پر پہاڑ کاٹے ہیں
گزار دی ہے شبِ انتظار کیا کہنا

یہ لہلہائے ہوئے کھیت آرزوؤں کے
ریاضِ حسن ہے دل کا دیار کیا کہنا

بسی تھی نکہتِ گیسو غریب خانے میں
ٹھٹک گئی ہے شمیمِ بہار کیا کہنا

rekhta

فرشتے عرش کو تکتے ہیں دُور سے صفدؔر
کہاں پہونچ گئی مُشتِ غبار کیا کہنا

جنوری ۱۹۳۹ء

rekhta

کم سے کم دل کو صنم خانہ بنایا ہوتا   اُن کے شایاں کوئی کاشانہ بنایا ہوتا
قصۂ غم کا وہ ٹکڑا جو وفَا کہلاتا   ہم نے افسانہ در افسانہ بنایا ہوتا
عشق بکتا تو تری فتنہ گری کیا اَے حسُن   ایک دن عقل کو دیوانہ بنایا ہوتا
قصۂ طور ہے کیا آپ کا ہر نازِ ہے بَرق   آپ نے بھی کوئی افسانہ بنایا ہوتا
پائمالی سے نکھرتے ہیں دلوں کے جوہر   دل کو خاکِ رہِ بُت خانہ بنایا ہوتا
انتظار اَور بھی کرتی نگہِ ناز اُن کی   شوق نے یوں جو نہ دیوانہ بنایا ہوتا
جس کے ہر لفظ پہ معصوم نظر جھُک جاتی   اِتنا رنگیں کوئی افسانہ بنایا ہوتا
وسعتِ ذوقِ پرستش کا تقاضہ تو یہ تھا   ذرّے ذرّے کو صنم خانہ بنایا ہوتا
جب تپش ہی سے عبارت تھا مرے دل کا مزاج   تو کسی شمع کا پروانہ بنایا ہوتا
یہ بنانا بھی بنانا ہے بنانے والے؟   اِس سے بہتر تو یہی تھا نہ بنایا ہوتا
کھُل گیا عشق پہ بیگانہ نگاہی کا فریب   اَور دیوانے کو دیوانہ بنایا ہوتا

قابلِ رشک ہے یہ عشق کی روداد مگر
تم نے صفدؔر اسے افسانہ بنایا ہوتا

دسمبر ۱۹۳۸ء

نگاہِ واپسیں اب بن رہی ہے ترجماں میری
ٹھہر اے موت ادھوری رہ نہ جائے داستاں میری

میں ہوں اک خاکِ درماندہ مجھے پہنچا دے محمل تک
ہے قسمت تجھ سے وابستہ غبارِ کارواں میری

قیامت آتے آتے رہ گئی وہ سو گئے ورنہ
لبِ افسانہ خواں تک آ چکی تھی داستاں میری

ستارے کانپ کر پلکوں سے دامن میں اُتر آئے
چراغاں میں سُنی اک بے وفا نے داستاں میری

مری حیرت ہے افسوں ہے مری حسرت ہے افسانہ
نہ حیرت رائیگاں میری نہ حسرت رائیگاں میری

دل اُن کی سمت پہلے ہی سے جھکتا تھا مگر اب تو
ہوئی جاتی ہے پیشانی بھی وقفِ آستاں میری

اُدھر اک زلفِ پُرخم میں ہیں آثارِ پریشانی
اِدھر بیتابیاں ترتیب دیتی ہیں فغاں میری

جنھیں آنسو بہانا چاہیئے وہ مسکراتے ہیں
تماشہ ہے کہ نغمہ بنتی جاتی ہے فغاں میری

خدا و ناخدا دونوں ہی چُپ ہیں دیکھیے کیا ہو
بھنور میں آ گئی ہے کشتیٔ عمرِ رواں میری

تصوّر میں ترے بھی پیار کی باتیں کبھی ہوتی ہیں
سُنا کرتا ہے کوئی دل میں بیٹھا داستاں میری

بیاں کرتی ہیں شمعیں انجمن میں سوزِ دل میرا
چمن میں بلبلیں کہتی ہیں صفدرؔ داستاں میری

نومبر ۱۹۳۸ء

اِک غنچۂ رنگیں ہے پھر چشمِ تماشا میں
پھر پھول برستے ہیں آغوشِ تمنّا میں

کیا عشق کی آنکھوں سے قطرہ کوئی ٹپکا ہے
ابھارِ تلاطم ہیں ٹھہرے ہوئے دریا میں

پھر قیس کی وحشت نے اِک بھیس نیا بدلا
اُٹھتا ہے بگولا سا پھر دامنِ صحرا میں

پھر شیوۂ خودداری قربانِ تمنّا ہے
کانٹا سا کھٹکتا ہے پھر اک دلِ رسوا میں

آغازِ محبت کی اللہ رے دلچسپی
ہر سمت تمہیں تم تھے پھیلی ہوئی دنیا میں

ہر آن فراغت تھی، ہر گام عبادت تھا
اللہ وہ کیا دن تھے جو کٹ گئے صحرا میں

کیا چیز مسرّت ہے یہ بھول گیا جیسے
یوں دل کو ملی لذّت آلامِ تمنّا میں

سورج کی تمازت میں جھلسا کیا جو راہی
کچھ چھاؤں ملی اُس کو اِک زلفِ چلیپا میں

برسوں جسے ٹھکرایا گردش نے زمانے کی
ذلّت کا خیال آئے کیا اس دلِ رسوا میں

کیا جانے کہاں ڈوبے یہ کشتیٔ دل اپنی
کھاتی ہوئی ہچکولے طوفانِ تمنّا میں

تابانیٔ عارض کو پردے کی ضرورت کیا
چھا جائے گی اِک حیرت خود چشمِ تماشا میں

سمجھا گئے وہ شاید کچھ دل کو نگاہوں سے
صفدرؔ یہ سکوں کیوں ہے جذبات کی دنیا میں

اکتوبر ۱۹۳۸ء

ہر اک لمحہ بلائے جاں ہے راحت کی گھڑی کیسی
خلش ہو موت کی دل میں تو صفۂ زندگی کیسی

ترے لُطفِ تبسم نے اٹھائے دل میں سو طوفاں
تری میٹھی نظر نے تلخ کر دی زندگی کیسی

پیام آتے ہیں زلفِ عنبریں کے اور میں غافل ہوں
اسے احساس کی اک موت کہیے بیخودی کیسی

طبیعت میں نہیں ہو دو دنیا کا فرق جب باقی
تو پھر یہ سینہ کوبی کیا ہے یہ جامہ دری کیسی

شہیدِ ناز کی تربت پہ کچھ کانٹے ہیں کچھ گل ہیں
یہ تیری شرحِ مبہم اے مآلِ عاشقی کیسی

ترا اقرار سچا ہے تو آنکھوں میں تبسم کیوں
ترے گُل رنگ ہونٹوں سے چھلکتی ہے ہنسی کیسی

ترا انکار جھوٹا ہے کہ تیرا دل دھڑکتا ہے
تبسم کوش آنکھوں میں چھلک آئی نمی کیسی

نہ ہو غمگیں خلوصِ بے غرض اُن کو منا لے گا
نیاز و ناز کی اِک کشمکش ہے برہمی کیسی

تلوّن حُسن کی فطرت، تڑپنا عشق کی قسمت
مسلسل ایک حالت ہو تو غم کیسا خوشی کیسی

جو تیرا نازِ خلوت محفل آرائی نہیں کرتا
تو یہ پیکر تراشی کیا ہے یہ صورت گری کیسی

یہ سچ ہے آپ اور سوزِ محبت اے معاذ اللہ
مگر یہ آج پلکوں پہ جھلکتی ہے نمی کیسی

نگاہِ حُسن نے کیفِ فراواں جب سے بخشا ہے
سرورِ جاوداں میرے لیے ہے بیخودی کیسی

تری وحدت جب اپنے عکس سے بھی رشک کرتی ہے
تو پھر یہ نازِ خود بیں کیا یہ آئینہ گری کیسی

محبت رفتہ رفتہ مجھ کو اُس منزل میں لے آئی
جہاں رونا بھی اب آتا نہیں صفدرؔ ہنسی کیسی

ستمبر ۱۹۳۸ء

rekhta

ہوا چمک کے خجل کامیاب ہو نہ سکا حریفِ رحمتِ دریا سراب ہو نہ سکا

وہ ابتدائے محبت، وہ ارتباطِ نظر جو واقعہ نہ بنا اور خواب ہو نہ سکا

مُسَلّم آپ کے حُسنِ ادا کی یکتائی مری نظر کا بھی لیکن جواب ہو نہ سکا

نثارِ جذبِ محبت کہ انفعال اُن کا کرشمہ بن گیا لیکن حجاب ہو نہ سکا

گُدازِ غم کی یہ کیفیتیں کہاں ملتیں زہے نصیب کہ مَیں کامیاب ہو نہ سکا

حقیقتوں نے لباسِ مجاز اُتار دیا تمہارا راز مگر بے حجاب ہو نہ سکا

نگاہِ شوق مری اُن حدوں کو چھُو آئی گمانِ عقل جہاں باریاب ہو نہ سکا

ہزار رنگ سے فطرت جواں ہوئی لیکن ترے شباب کا کوئی جواب ہو نہ سکا

یہ اعتبارِ محبت کہ احتیاط پہ بھی مری نگاہ سے اُن کو حجاب ہو نہ سکا

اُسی سے کوئی محبت کی لذتیں پوچھے جو بدنصیب کبھی باریاب ہو نہ سکا

تری نگاہ دُو عالم سے بے نیاز رہی مری نظر سے مگر اجتناب ہو نہ سکا

ہے وقت جس کے تعاقب میں آج بھی صفدرؔ وہ رہ گزر میں رہا باریاب ہو نہ سکا

جولائی ۱۹۳۸ء

در پہ پہنچا تھا کہ موت آگئی دیوانے کی
انتہا کتنی اچانک ہوئی افسانے کی

تیرے صحرا میں ہے کس دیدۂ خونبار سے رنگ
کن تمناؤں پہ بنیاد ہے ویرانے کی

اپنی پُرکیف نگاہوں کا اثر دل پہ نہ پوچھ
جام میں روح کھنچی آتی ہے میخانے کی

چھلکی جاتی ہیں ستاروں کی منور آنکھیں
اور تمہید ابھی ہے مرے افسانے کی

دیکھتے دیکھتے رندوں کا جنوں جاگ اُٹھا
دامنِ ابر میں تصویر تھی میخانے کی

حلقۂ زلفِ رسا، حلقۂ آغوشِ جمال
کتنی رنگین ہیں کڑیاں مرے افسانے کی

بہکی بہکی ہوئی یارب وہ نگاہیں کیا ہیں
شان ہے جن میں چھلکتے ہوئے پیمانے کی

رفتہ رفتہ یہ بڑھا سلسلۂ کیفِ نظر
ایک ایک بوند میں تصویر ہے میخانے کی

اِک تبسم دمِ آخر کہ حکایت ہو لذیذ
انتہا کچھ تو رِجائی رہے افسانے کی

تیری آنکھوں سے جو قطرہ کوئی ٹپکے اے شمع
جان آجائے ابھی خاک میں پروانے کی

جامِ مہتاب سے ڈھلنے لگی رنگین شراب
کتنی پُرکیف فضا ہے مرے غم خانے کی

خالِ مشکیں کا تصور، خمِ گیسو کا خیال
یہی دلچسپ بلائیں ہیں سیہ خانے کی

کیا سے کیا کہہ گیا وہ جوشِ جنوں میں اور عقل
دیکھتی رہ گئی صورت ترے دیوانے کی

rekhta

اک محبت ہی نہیں کتنے جنوں ہیں صفدر
کس کو فرصت ہے یہاں ہوش میں آجانے کی

جون ۱۹۳۸ء

rekhta

ہمارے دل کی آہیں جائیں گی یوں رائیگاں کب تک
کریں گے سازشیں مل کر زمین و آسماں کب تک

نہ دیکھے گی نگاہِ برق و چشمِ باغباں کب تک
چھپے گا پتیوں کی اوٹ میں یوں آشیاں کب تک

تری شانِ کرم کی وسعتوں سے مجھ کو شکوہ ہے
خلا میں ہر طرف بھٹکی پھرے میری فغاں کب تک

یہ مانا حُسن کی تاثیر سے ہونٹوں پہ مُہریں ہیں
مگر جذبات کے مارے نہ کھولیں گے زباں کب تک

دلِ مایوس میں اِک لَو سی اُٹھ کر بیٹھ جاتی ہے
مگر کب تک؟ فریبِ آرزو یہ امتحاں کب تک

پگھل جائے گا لوہا غم کے شعلوں کو بھڑکنے دو
جنوں کا راستہ روکے رہیں گی بیڑیاں کب تک

کوئی دعویٰ کرے کیا اُن کا جلوہ اُن کا جلوہ ہے
مگر پھر بھی فریبِ مہر و ماہ و کہکشاں کب تک

نقابِ لالہ و گُل کی اُڑا دیں دھجیاں آخر
جنوں برداشت کرتا یہ حجابِ درمیاں کب تک

لبوں تک آ کے رُک جاتی ہے اِک فریاد کی لَے سی
بتلا اَے نامرادی عشق کا حُسنِ گماں کب تک

عقیدت مند کو کافی ہے سایہ بھی تصوّر کا
کسی کی بے رُخی دیکھوں تو لے گی امتحاں کب تک

جب احساسِ خودی گُم ہو رہا ہے عشق میں صفدرؔ
تو پھر یہ شورشِ جذبات کب تک یہ فغاں کب تک

فروری ۱۹۳۸ء

گھبرا کے میرے خانۂ ویراں میں آ گئے
تم کیوں فریبِ نالۂ ہجراں میں آ گئے

اک میرے اضطراب کا اللہ رے معجزہ
نشوانتشار گیسوئے پیچاں میں آ گئے

کیونکر نہ فق ہو رنگ شبِ ماہتاب کا
وہ چاند بن کے خانۂ ویراں میں آ گئے

جمعیتِ خیال سے میری خفا تھے وہ
گیسو بدوش خوابِ پریشاں میں آ گئے

قطرات بچ گئے تھے جو طوفانِ شوق سے
گل سوئے اتفاق سے مژگاں میں آ گئے

تم تو کھڑے تھے ساحلِ دریائے عشق پر
کس طرح سیلِ دیدۂ گریاں میں آ گئے

طوفاں اٹھا رہے تھے جو کچھ سادہ دل حباب
شاید وہ خود بھی آج اسی طوفاں میں آ گئے

فتنے بچے ہوئے تھے جو تخلیقِ حشر سے
ترتیب پا کے پیکرِ جاناں میں آ گئے

اے پیرویٔ لغزشِ آدم تری پناہ
ہم بھی فریبِ جذبۂ عصیاں میں آ گئے

تاروں میں نور ہے نہ فضاؤں میں کیف ہے
صفدر اتر کے وہ دلِ ویراں میں آ گئے

۱۸ دسمبر ۱۹۳۷ء

مری مشقِ تصوّر کامراں معلوم ہوتی ہے
ہر اک شے اُن کا سنگِ آستاں معلوم ہوتی ہے

تپش سینے کی پھر آتش فشاں معلوم ہوتی ہے
پھر اک حسرت مرے دل میں جواں معلوم ہوتی ہے

خودی کے دائرے کو عشق نے دی اس قدر وسعت
کہ ہر اُفتاد اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے

یہی ہے زندگی تو چند سانسوں کا بھروسہ کیا
ہوا پر ہم کو بنیادِ جہاں معلوم ہوتی ہے

چمن کی زینتیں کیا آئینہ دکھلائیں گی اُن کو
یہ رنگینی اُنھیں کی ترجماں معلوم ہوتی ہے

طلسمِ رنگ کا دھوکا نہ کھا اے دیدۂ بینش
کہ یہ دنیا مقامِ اِمتحاں معلوم ہوتی ہے

چھپاؤں بھی تو دل کا بھید ظاہر ہو کے رہتا ہے
کہ اپنی ہر نظر اب تو زباں معلوم ہوتی ہے

یہ افسونِ نظر شاید جوانی کا کرشمہ ہے
جدھر نظریں اٹھیں ہر شے جواں معلوم ہوتی ہے

محبت اس تلاطم میں بھی جس اُمید پر قائم
وہ اک تنکا بہ سیلابِ رواں معلوم ہوتی ہے

حجاب اُٹھتے گئے بڑھتا گیا احساسِ محرومی
نظر بھی اب حجابِ درمیاں معلوم ہوتی ہے

نگاہِ معتبر نے اس طرح ذرّوں کو چمکایا
کہ اب تو یہ زمیں بھی آسماں معلوم ہوتی ہے

جہاں سے آنسوؤں میں رنگ آتا ہے تبسّم کا
وہیں سے کچھ مزے کی داستاں معلوم ہوتی ہے

مجھے پھونکے ہوئے بجلی کے تنکے بھی گلستاں میں
یہ بربادی بھی حسنِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

rekhta

سکوتِ شب میں کیوں تاروں کی آنکھیں ڈبڈباتی ہیں   یہ بستی میرے دل کی ہرلنداں معلوم ہوتی ہے

تصوّر کے اُجالوں میں لے ترتیب شے مختصر
پریشاں تیرے دل کی داستاں معلوم ہوتی ہے

اگست ۱۹۳۷ء

rekhta

کیا زیست آب و رنگ کا دھوکا کہیں جسے
اہلِ نگاہ خوابِ زلیخا کہیں جسے

کم ہا گئی جرأتِ دیدار کی قسم
دیکھا ہے یوں انھیں کہ نہ دیکھا کہیں جسے

اِک عمر کے تلاطمِ جذبات کا نچوڑ
پلکوں پہ ہے وہ بوند کہ دریا کہیں جسے

حسرت بھری نظر نے انھیں دیکھ دیکھ کر
ایسا بنا لیا ہے کہ اپنا کہیں جسے

اِک قلبِ مضطرب کہ لبالب ہے مثلِ جام
اِک چشمِ بادہ ریز کہ مینا کہیں جسے

آنکھوں پہ کیا ہو اہلِ بصیرت کو اعتبار
وہ جلوگی ہے آج کہ پردا کہیں جسے

نظارہ ہائے حسن کا حاصل نہ پوچھئے
اِک خیرگی متاعِ تماشا کہیں جسے

کس کی نظر کا فتنۂ شورش پسند ہے
یہ محشرِ حیات کہ دنیا کہیں جسے

بخشی ہے دل کے زخم کو تیرے خیال نے
وہ تازگی کہ جانِ تمنا کہیں جسے

نالہ یہی ہے جب تو اثر کا سوال کیا
اِک ایسی کیفیت ہے کہ نغمہ کہیں جسے

پھیلے تو کائنات ہے سمٹے تو اک نگاہ
یہ نازِ حسن ایک کنایہ کہیں جسے

ذرہ بھی ناز کرتا ہے اپنے وجود پر
مٹھی میں ہے وہ چیز کہ صحرا کہیں جسے

باایں ہمہ نمودِ شرر زندگی ہے کیا
اِک کھیل آب و گل کا تماشا کہیں جسے

اِک طفلِ سادہ دل کے گھروندے کی طرح ہے
صفدرؔ یہ مُشتِ خاک کہ دُنیا کہیں جسے

جولائی ۱۹۳۷ء

rekhta

سرِ محفل طبیعت کے لیے گو بار ہوتے ہیں
مگر خلوت میں ہم پیشِ نگاہِ یار ہوتے ہیں
بھلا یہ شمع کیا ہوگی انیسِ شامِ تنہائی
انھیں کی یاد سے روشن در و دیوار ہوتے ہیں
تصور ہو تو غم کی رات بھی بھاری نہیں ہوتی
وہ خود آ آ کے تسکینِ دلِ بیمار ہوتے ہیں
شفق کی سرخیاں رنگینیاں صحنِ گلستاں کی
یہ محضر خونِ حسرت کے لیے تیار ہوتے ہیں
کچھ ایسے ہیں کہ جن کی پیاس خم سے بھی نہیں بجھتی
کچھ ایسے ہیں کہ ممنونِ نگاہِ یار ہوتے ہیں
سرِ آئینہ ہر دلکش ادا کا جائزہ لے کر
نگاہِ شوق سے وہ برسرِ پیکار ہوتے ہیں
مبارک اے جبینِ شوق تجھ کو یہ سرافرازی
ترے سجدے نثارِ آستانِ یار ہوتے ہیں
مرے معبود کچھ ترمیم کر رسمِ عبادت میں
کہ یہ آدابِ روحِ بندگی پر بار ہوتے ہیں
منازل تربیت کے ہیں تجلی کیا تحیر کیا
نگاہیں خیرہ ہوتی ہیں تو دل بیدار ہوتے ہیں
جنوں میں عشق پر وہ کیف کا عالم بھی ہوتا ہے
کہ تیور حسن کے خود مائلِ دیدار ہوتے ہیں
ہرے ہوتے ہیں تیری گفتگو سے زخمِ بلبل کے
دہن سے پھول جھڑتے ہیں چمن گلزار ہوتے ہیں
نتیجے کی زبانیں عقل سے یہ کہتی جاتی ہیں
محبت کے سوا سب مشغلے بیکار ہوتے ہیں
نہ جا اے دل ادھر سے ہو جدھر سایہ درختوں کا
کہ یہ رستے مسافر کے لیے دشوار ہوتے ہیں

خدا کی بندگی کا قرض ہوتا ہے ادا صفدرؔ
ترے سجدے جو صرفِ آستانِ یار ہوتے ہیں

جون ۱۹۳۷ء

rekhta

کھا کر فریب اُس کا اِعادہ نہ کیجیے
ہر بار اعتبارِ زمانہ نہ کیجیے

کیجے پر اِس طرح بھی تمنّا نہ کیجیے
توہینِ چشمِ شوق گوارا نہ کیجیے

انفاسِ زندگی کو سمجھیے نہ رائیگاں
ہر وَلولے پہ سجدۂ شکرانہ کیجیے

آنکھوں میں اُن کی آگیا اِک رنگِ انفعال
اے دِل بس اب شکایتِ بیجا نہ کیجیے

دُھوکا نہ ہو کہیں کہ ستمگر ہیں آپ بھی
ذکرِ جفا پہ آنکھ جُھکایا نہ کیجیے

خود حوصلہ دیا تھا محبت کو آپ نے
اب جرأتِ نگاہ کو رسوا نہ کیجیے

میں اور خیالِ ترکِ محبت غلط غلط
آپ اعتبارِ شہرتِ بیجا نہ کیجیے

ہر جنبشِ نظر میں ہے اک کائناتِ شوق
اندازۂ ہجومِ تمنّا نہ کیجیے

دیوانگی عطیۂ لُطفِ نگاہ ہے
اب رازداریوں کا تقاضا نہ کیجیے

اِک لفظ میں سمیٹ دیا ہم نے عشق کو
آپ اس کو طول دے کے فسانہ نہ کیجیے

خاموش التجاؤں کی پُرسش کہیں نہیں
یہ کس کا مشورہ ہے کہ نالہ نہ کیجیے

عشق و خودی میں ہے یہی شکلِ مفاہمت
یعنی کہ عشق کیجیے تمنّا نہ کیجیے

شام و سحر خدا سے دُعا مانگ کر
صفدر بُتوں کے عشق کو رسوا نہ کیجیے

مئی ۱۹۳۷ء

جنونِ عشق ہے صفدر کہیں یہ دل سے نکلے گا
جو اِس کوچے میں آئے گا بڑی مشکل سے نکلے گا
نتیجہ کچھ تو میرے ضبطِ لاحاصل سے نکلے گا
چمن میں آگ چھڑکے گا جو نالہ دل سے نکلے گا
نظر دل سے نہ ہٹ جائے کہیں اے ذوقِ نظّارہ
کہ اُن کا کاروانِ ناز اسی منزل سے نکلے گا
ہراساں کیوں ہے گر کشتی بھنور میں آگئی دل کی
محبت کا سفینہ ڈوب کر ساحل سے نکلے گا
سمٹ آئیں اگر آنکھوں میں برقِ حُسن کی لہریں
تو اِک شعلہ جہاں افروز میرے دل سے نکلے گا
اڑائی ہے جو خاک اہلِ سفر نے اُس کو چھٹنے دو
کوئی رستہ اسی گردِ رہِ منزل سے نکلے گا
حرم کیا بُتکدے بھی کر نہیں سکتے قبول اُس کو
فریبِ لُطف کھا کر جو تیری محفل سے نکلے گا
خلوصِ دل یہ کہتا ہے قدم آگے بڑھائے جا
کوئی خود مسکرا کر پردۂ محمل سے نکلے گا
وہ خود دیکھیں گے اپنے حُسن کی یہ عالم آشوبی
یہ پہلو بھی مری وارفتگی دل سے نکلے گا
سجائے جا چکیں گے جب بساطِ عرش کے تارے
ہمارا چاند بھی ہنس کر حریمِ دل سے نکلے گا
ہماری آرزو ہے خواہشِ محبوب کے تابع
ہمارا مدعا نکلا تو اس کے دل سے نکلے گا

مری شعلہ نوائی پھونک دے گی بزم کو صفدر
پسینہ شمع کا بھی گرمیٔ محفل سے نکلے گا

مارچ ۱۹۳۷ء

کس جگہ ہم ہیں یہ کس کی جلوہ گاہِ ناز ہے
دل کی خودداری یہاں صفدر سپر انداز ہے

ارتباطِ باہمی کا یہ بھی اک اعجاز ہے
اُن پہ دنیا مٹ رہی ہے اور ہم کو ناز ہے

عشق کو ہر چند اپنی بے خودی پہ ناز ہے
حُسن کا اندازہ پھر بھی حُسن کا انداز ہے

دیکھئے انجام کیا ہو حسرتِ دیدار کا
ہم سراپا شوق ہیں اور وہ سراپا ناز ہے

پھر مرے نالے فلک سے جا کے ٹکرانے لگے
آج پھر کانوں میں میرے دُور کی آواز ہے

اللہ اللہ حُسن تیری عالم آشوبی کہ تو
اک زمانے پر عیاں ہو کر بھی اب تک راز ہے

زیرِ پا آئے تمہاری جستجو میں مہر و ماہ
اور ابھی تک فکرِ انساں مائلِ پرواز ہے

دل سراپا نغمگی اور لب سراپا خامشی
عشق تیری گفتگو کا بھی عجب انداز ہے

حسرت اے ذوقِ تماشا ڈگمگاتے ہیں قدم
وہ بڑھے آگے جسے تابِ نظر پہ ناز ہے

دیکھئے اس مرحلے میں کس کی ہوتی ہے شکست
ہم کو دل پہ اُن کو اپنی دلبری پہ ناز ہے

رنگِ رُخ نے رفتہ رفتہ کہہ دی ساری داستاں
ہم سمجھتے تھے خموشی پردہ دارِ راز ہے

دیکھئے یہ مہر پہ یا ماہ پر ڈالے کمند
ابتدائے زندگی اِک عالمِ پرواز ہے

دوست خاموشی کو میری خواہ کچھ مفہوم دیں
راز کی جو بات تھی صفدرؔ وہ اب تک راز ہے

فروری ۱۹۳۷ء

ہم بھی کچھ دور نہیں آپ بھی کچھ دور نہیں
بس یہی کہتے کہ ملنا ہمیں منظور نہیں

حسن تاریخ کو دہرائے یہ دستور نہیں
دارِ منصور نہیں، جلوہ گہہِ طور نہیں

کیجئے غور تو پردے میں بھی ہے شانِ ظہور
حسنِ مستورِ نظر ہو کے بھی مستور نہیں

پائے ساقی پہ بھی ہو جاتی ہے رندوں کی نماز
میکدے میں کوئی پابندیٔ دستور نہیں

کوئے جاناں کے چمکتے ہوئے ذرّے ہیں گواہ
کس جگہ میری نگاہوں کے لیے طور نہیں

بارہا ہجر میں یہ میں نے کیا ہے محسوس
آنکھ سے دور ہیں وہ دل سے مگر دور نہیں

نالہ گرم ہی کافی ہے اگر ضبط نہ ہو
برق کچھ اہل نشیمن سے بہت دور نہیں

زندگی مانگتی تھی ایک شعاعِ امید
نہ سہی اُن کے تبسم کو جو منظور نہیں

پرسشِ حال پہ مائل ہیں نگاہیں اُن کی
دل کا یہ ننگ کہ اِک بات کا مقدور نہیں

بوئے گُل، نالۂ بلبل، نفسِ سردِ نسیم
کون اِس باغ میں آزاد ہے مجبور نہیں

کیفیت دیدۂ رنگیں کی سلامت ساقی
کون میخانے میں اس جام سے مخمور نہیں

اپنی بے کیفیٔ فریاد تو دیکھو صفدر
نالہ نالہ ہو تو نالے سے اثر دور نہیں

۱۷ جنوری ۱۹۳۰ء

بنا کر چارہ سازِ دل جنونِ فتنہ بساماں کو
سمجھتا ہوں میں ننگِ پیرہن جیبِ گریباں کو

نگاہِ ناز میں آج ایک میلانِ تبسّم ہے
بڑھ اے دستِ تمنّا تھام لے اب اُن کے داماں کو

یہ دل کی جاگتی چنگاریاں شعلہ نہ بن جائیں
لپک اِن کی کہیں چھُو لے نہ بڑھ کر اُن کے داماں کو

مری آنکھوں کی حیرانی بجائے خود ہے معذوری
یہ معذوری مبارک ہو جمالِ فتنہ ساماں کو

قفس کی تیلیاں اُڑ اُڑ کے جاتی ہیں گلستاں تک
مرے ذوقِ پَرافشانی پہ حیرت ہے گلستاں کو

نظر اُن کی محبت کو نہ دے اِلزامِ بیتابی
وہ آتے ہیں کوئی سی دے مرے چاکِ گریباں کو

صبا کس ناز سے منہ چومتی پھرتی ہے کلیوں کا
میں کِن حسرت بھری نظروں سے تکتا ہوں گلستاں کو

مزے آنے لگے ذوقِ خلش کے اے دلِ مضطر
تصوّر میں یونہی جنبش دیئے جا اُن کے پیکاں کو

الٰہی اِس سے بڑھ کر نااُمیدی اور کیا ہوگی
کہ ہم نے سونپ دیں آزادیاں آغوشِ زنداں کو

تم اپنی جنبشِ لب سے انہیں ترتیب دے دیتے
فراہم کر رہا ہوں دل کے اجزائے پریشاں کو

یہ فصلِ گُل کی آمد اور یہ پابندئ تمکیں
جنوں یہ بھی خبر ہے منہ دکھانا ہے بیاباں کو

کسی کی مَست آنکھوں سے متاعِ کیف لے لے کر
مرے نغموں نے میخانہ بنایا ہے بیاباں کو

جن آنکھوں کو بصیرت دی ہے صفدر موسمِ گُل نے
وہ پڑھ لیتی ہیں ہر ذرّے میں تاریخِ گلستاں کو

دسمبر ۱۹۳۶ء

بٹھا کے ہم اُن کو دل کی خلوت میں داغ اپنے دکھا رہے ہیں
بجھے چراغوں میں روشنی ہے، وہ زیرِ لب مسکرا رہے ہیں
تجلّیاں چھن رہی ہیں چلمن سے راستے جگمگا رہے ہیں
قریب ہے آدمی کی منزل فرشتے پردہ اُٹھا رہے ہیں
ابھی وہ صورت دکھا رہے تھے، ابھی وہ صورت چھپا رہے ہیں
مرا تصوّر ہے اُن کا پردہ اُٹھا رہے ہیں گرا رہے ہیں
وہ سانولی اور سلونی صورت نمک چھڑکتی ہے زخمِ دل پر
کہ بڑھ رہی ہے خلش کی لذّت تو زخمِ دل مسکرا رہے ہیں
خوشا یہ لمحاتِ شامِ فرقت کہ ہے تصوّر کی شمع روشن
وہ کھول کر ذہن کا دریچہ کھڑے ہوئے مسکرا رہے ہیں
یہ گدگداتا ہوا تبسّم جگر کی شورش بڑھا رہا ہے
یہ مسکراتے ہوئے کنائے حجابِ دُوری اُٹھا رہا ہے
ہے دُور ابھی تو مقامِ لغزش، ہے شوق ابھی سے تمام لغزش
نظر نظر تھرا رہی ہے، قدم قدم ڈگمگا رہے ہیں

ہے اُن کے تابع دِلوں کی بستی اُبھر رہے ہیں نقوشِ ہستی
بنا رہے ہیں مٹا رہے ہیں، مٹا رہے ہیں بنا رہے ہیں

حیا سے آنکھیں جُھکی ہوئی ہیں، لبوں پہ آہیں رُکی ہوئی ہیں
نہ کچھ مرے دل کی سُن رہے ہیں، نہ اپنے دِل کی سُنا رہے ہیں

قدم میں لغزش، نظر میں مستی، لبوں پہ اِک طنزیہ تبسّم
تری محبت کا آئینہ ہیں جہاں کو حیراں بنا رہے ہیں

ہے اُن کا چھپا ہوا تبسّم سرورِ تجدیدِ عہد و پیماں
نظر ہے گہوارۂ تمنّا دِل و جگر مُسکرا رہے ہیں

حجابِ خورشید و ماہ و انجم، شبابِ ریحان و لالہ و گُل
پڑا ہے عکسِ جمال کس کا کہ سب۔ کے سب جگمگا رہے ہیں

مری تمنّا کی نامرادی سے کھُل رہی ہیں دِلوں کی آنکھیں
تمہاری دُنیا میں میرے نالے نیا شعور اِک جگا رہے ہیں

ہے یہ بھی اِک عشق کا کرشمہ گماں کی شدّت یقین بنی ہے
فریبِ ذوقِ نظر ہے صفدرؔ وہ آ رہے ہیں نہ جا رہے ہیں

دسمبر ۱۹۳۶ء

جو رہ گئے تھے کرشمے دکھائے جاتے ہیں
تعینات کے پردے اُٹھائے جاتے ہیں

ہم اس طرح متحمل بنائے جاتے ہیں
کس احتیاط سے پردے اُٹھائے جاتے ہیں

اگر ظہور یہی ہے تو پھر حجاب ہے کیا
قریب آ کے بھی وہ دُور پائے جاتے ہیں

خوشا یہ آئینہ داری کہ نافدانِ جمال
کس اہتمام سے بسمل بنائے جاتے ہیں

جفا کے بعد ہے عُذرِ جفا بھی ایک ادا
نظر خجل ہے مگر مُسکرائے جاتے ہیں

یہ کس نے توڑ دی توبہ کہ میکدے والے
جو میکدے میں ہے سب کچھ لُٹائے جاتے ہیں

سکون آہ سے ملتا ہے قلبِ سوزاں کو
اسی ہوا سے یہ شعلے بجُھائے جاتے ہیں

وفا شعار ہمیں سے تھے اُٹھی، ہمیں پہ نظر
جو معتبر ہوں وہی دل دُکھائے جاتے ہیں

نگاہِ رند میں کیسا یہ کیف ہے سَاقی
کہ تیرے پائے سبک ڈگمگائے جاتے ہیں

وہ کاروانِ عقیدت گزر گیا لیکن
نشانِ سجدہ سرِ راہ پائے جاتے ہیں

اُنھیں سے لیتی ہے محفل تری چراغ کا کام
جو داغ سینۂ شاعر میں پائے جاتے ہیں

تمام رات ستارے ہیں گوش بر آواز
یہ کس کے ساز سے نغمے سُنائے جاتے ہیں

شکستہ حالیٔ سنگِ مزار کہتی ہے
کہ تُربتوں کے نشاں تک مٹائے جاتے ہیں

حضورِ دوست یہ اندازِ باریابی ہے
زبان بند ہے لب تھرتھرائے جاتے ہیں

یہ جلوہ گاہ ہے مسجد نہیں ہے اے واعظ
یہاں تو ذوقِ نظر آزمائے جاتے ہیں

پھر آ رہا ہے کوئی پردہ دار کیا صفدرؔ
چراغِ بزمِ تصوّر بجھائے جاتے ہیں

نومبر ۱۹۳۶ء

خیال و خواب کی دُنیا میں لا کے لُوٹ لیا
تری قسم تجھے تجھ سے چھپا کے لُوٹ لیا

طریقِ رہزنی رنگ رنگ دیکھے ہیں
نظر ملا کے، نگاہیں چُرا کے لُوٹ لیا

حریمِ دل میں انھیں شوق نے جگہ دی تھی
اُنھوں نے شوق کا سرمایہ آ کے لُوٹ لیا

نگاہِ ساقیِ توبہ شکن کو کیا کہیے
کہ ایک جرعۂ شیریں پلا کے لُوٹ لیا

میں چُپ ہوں لذتِ دیدار کی خلش پا کر
وہ ہنس رہے ہیں کہ بسمل بنا کے لُوٹ لیا

غرورِ حُسن خفا ہے کہ اے جنوں تو نے
ادائے چاکِ گریباں دکھا کے لُوٹ لیا

کسی کے حُسن کو اپنا بنا رہا ہوں میں
کسی کے حُسن نے اپنا بنا کے لُوٹ لیا

ترے حجاب نے چُپ کر دیا گواہوں کو
کہے یہ کون ہمیں مُسکرا کے لُوٹ لیا

گلوں کے بھیس میں تاروں کے روپ میں تو نے
حقیقتوں کو تماشا بنا کے لُوٹ لیا

نگاہِ شوخ نے بجلی سی دل میں دوڑا دی
پھر اُس کو دردِ مجسم بنا کے لُوٹ لیا

بڑھے جو کوئے بُتاں سے تو کعبہ تھا سرِ راہ
قدم قدم پہ ہمیں آزما کے لُوٹ لیا

رُکے جو ہم تو تبسم سے حوصلہ بخشا
بڑھے جو ہم تو نگاہیں پھرا کے لُوٹ لیا

کلی بھی میری محبت پہ مُسکراتی ہے
بھری بہار میں بیکس بنا کے لُوٹ لیا

وہ جن کو لُوٹ پہ تھا اپنی ناز اے صفدرؔ
انھیں بھی کل غزل اپنی سُنا کے لُوٹ لیا

اکتوبر ۱۹۳۶ء

اپنی آنکھوں میں لئے شب کا خُمار آ ہی گیا
صبح سے پہلے وہ جانِ انتظار آ ہی گیا

برہمی سچی تھی لیکن دل کو کیوں آتا یقیں
دلدہی جھوٹی تھی لیکن اعتبار آ ہی گیا

ایک مبہم سی نظر اور اُس میں مبہم سا جواب
دل مگر جو پائے تسکیں تھا اقرار آ ہی گیا

اے تصورِ اس خرابے میں بھی چھٹکی چاندنی
آخرِ اس وحشت سرائے دل میں یار آ ہی گیا

ہم سے پوچھو اُن کی نظروں کا طلسمِ التفات
درد باقی ہے مگر دل کو قرار آ ہی گیا

لن ترانی کہہ کے بھی کچھ مُسکرائی برقِ طُور
یعنی طرزِ لکنتِ سائل پہ پیار آ ہی گیا

نالۂ دل سوزِ غم سے تربیت پاتا رہا
رفتہ رفتہ ایک طرزِ خوش گوار آ ہی گیا

جس نے اِک میٹھی نظر کی دل ہوا اُس پہ نثار
مُسکرا کر جس نے دیکھا اُس پہ پیار آ ہی گیا

اللہ اللہ اعتبارِ شوق کی خوش فہمیاں
میں یہ سمجھا جیسے وہ جانِ بہار آ ہی گیا

اِک ادائے دلبری پر مٹ گئے ہوش و حواس
لاکھ سمجھایا دلِ بے اختیار آ ہی گیا

تیرے چہرے کے تکدّر کا ہوا دل پر اثر
آخرش اس آئینے پر بھی غبار آ ہی گیا

ناز نے پہرے بٹھائے جنبشِ لب پر مگر
اِک تبسم آنکھ میں بے اختیار آ ہی گیا

اُس کی خودداری کو بھی دی تیری غفلت نے شکست
لب پہ صفدر کے بھی شکوہ بار بار آ ہی گیا

اکتوبر ۱۹۳۶ء

اُٹھو صفدرؔ دلِ وحشت زدہ کا امتحاں کر لیں
سحر کی منفعل آہوں سے تکمیلِ فغاں کر لیں

مری بیتابیوں نے دو نہیں اک لمحہ فرصت کا
کہ وہ اپنی نظر کا میرے دل پر امتحاں کر لیں

ہمیں اے شوق دُودِ آہ پر اپنے بھروسہ ہے
جہاں چاہیں وہاں پیدا جوابِ آسماں کر لیں

براہِ راست وہ جلوہ دلوں سے اب مخاطب ہے
زباں دانِ محبت ہم تمامِ چشم و زباں کر لیں

میں جس تارے کو دیکھوں اُس کے دل کا نور بجھ جائے
وہ جن ذرّوں پہ ہنس دیں اُن کو رشکِ کہکشاں کر لیں

یہ کعبہ بھی تو اک نقشِ جبینِ اہلِ طاعت ہے
ترے مجذوب جس پتھر کو چاہیں آستاں کر لیں

چمن کا تنکا تنکا اک زبانِ حال ہے گویا
اِنہیں کو کیوں نہ پھر ترتیب دے کر داستاں کر لیں

ترے تیور نہیں دیتے زباں کو اذنِ گویائی
ہم اپنا حالِ دل آنکھوں ہی آنکھوں میں بیاں کر لیں

جوابِ جلوۂ برقِ تجلّی اُن کو دیتا ہے
وہ خود کو دیکھ کر میری نظر کا امتحاں کر لیں

حرم میں رہ کے شوق اپنا سبک سر بن گیا صفدرؔ
بُتوں کو سجدہ کر کے کیوں نہ اِس کو سرگراں کر لیں

ستمبر ۱۹۳۶ء

آئینے جب بن رہے تھے عکس جب بے نام تھا
یعنی جب کچھ بھی نہ تھا تو تیرا جلوہ عام تھا

پھر رہا تھا عارضِ گُل پر مری نظروں کا رنگ
کس قدر رنگیں طلوعِ شوق کا ہنگام تھا

یاد آیا ہے کبھی اپنا بھی تھا دورِ نشاط
ہم نے جس ساغر کو دیکھا وہ ہمارا جام تھا

کوندتی پھرتی تھی چشمِ شوق میں برقِ جمال
وہ بھی کیا دن تھے کہ لب پہ صرف اُن کا نام تھا

چشمِ حیرت کا بُرا ہو جس نے کھویا لُطفِ دید
ورنہ اُن کی ہر ادا میں زیست کا پیغام تھا

اُن کی آنکھوں میں بھی فرطِ غم سے آنسو آ گئے
کتنا تابندہ جوابِ حسرتِ ناکام تھا

ذرّے ذرّے کی زباں پر تھی حدیثِ دردِ عشق
راز رکھنے پر بھی دل کا راز کتنا عام تھا

ہر شکستِ دل سے پہلے ہر شکستِ دل کے بعد
اُس نگاہِ مُنفعل میں اِک نیا پیغام تھا

مژدۂ صبحِ مسرّت بھی ہے اب جس پر گراں
یہ وہی دل ہے جو محوِ انتظارِ شام تھا

عمر بھر سمجھا کیے ہم حُسن کو ہنگامہ خیز
غور سے دیکھا تو دل ہی محشرِ آلام تھا

تیرے میخانے میں بھی آیا تھا دورِ اختیار
اپنا اپنا ہاتھ تھا اور اپنا اپنا جام تھا

کیا زمانہ ہے کہ اِس لب پر خدا کا ذکر ہے
کیا زمانہ تھا کہ اِس لب پر بُتوں کا نام تھا

یاد تو ہوگا تمھیں وہ شاعرِ آشفتہ حال
جس کو تم کہتے تھے مجنوں، جس کا مقصد نام تھا

ستمبر ۱۹۳۶ء

○

طاقتِ صبر ہے یارائے شکیبائی ہے　　پھر بھی پردے نے نہ اُٹھنے کی قسم کھائی ہے
حُسن آئینے میں خود اپنا تماشائی ہے　　جرأت اے عشق یہی وقتِ جبیں سائی ہے
نوحہ گر آ گئے موت آ گئی اب دیر ہے کیا　　وہ بھی آئیں جنھیں دعوائے مسیحائی ہے
جگمگاتی ہے ستاروں سے گُذرگاہ تری　　آنے والے یہ مرا فیضِ جبیں سائی ہے
اُن کی آنکھوں میں پھر آنسو ہیں خدا خیر کرے　　اِک کہانی نگہِ یاس نے دُہرائی ہے
کھینچ لایا ہے تصوّر میں اُنھیں جذبۂ دل　　آج تو حسرتِ دیدار کی بَن آئی ہے
دیکھنا یہ ہے کہ کس سمت برستا ہے سرود　　اِک اُمنڈتی ہوئی بدلی تری انگڑائی ہے
اُسی آغوش میں اَے کاش مجھے غش آجائے　　جس کی خوشبوئے بدن ہوش میں لے آئی ہے
دفعتاً ہو گئے جذباتِ محبت بیدار　　کیا قیامت تری ٹوٹی ہوئی انگڑائی ہے
اب تو آجاؤ کہ دَر سے نہیں ہٹتی ہے نگاہ　　روحِ بیتاب اِن آنکھوں میں سمٹ آئی ہے
بارہا توڑ دیئے باندھ کے پیماں میں نے　　بارہا اُن سے نہ ملنے کی قسم کھائی ہے
دل میں کس ماہ جبیں کا ہے تصوّر صفدرؔ　　جس کا پَرتو ترے اشعار کی رعنائی ہے

۹ اگست ۱۹۳۶ء

خبر کیا گُشتۂ ذوقِ سفر کو اپنی منزل کی
وہ ننگِ سعی ہے صفدر جسے پروا ہو حاصل کی

خدا جانے خودی کو ہوش کب آئے کہاں آئے
خدا جانے کہاں لے جائے دل کو بیخودی دل کی

لہو بن بن کے ٹپکیں حسرتیں چشمِ تمنّا سے
نظر نے اُن کی چھیڑا تھا کہ رگ رگ کھُل گئی دل کی

سمجھ لیتی ہے جب کشتی حقیقت جوشِ طوفاں کی
تو ہر گرداب میں صورت نظر آتی ہے ساحل کی

وہ جاتے ہیں مگر خوشبو تو اپنی چھوڑے جاتے ہیں
ٹھہر اے رنگِ رُخ رونق ابھی باقی ہے محفل کی

مرا ساغر ہے نازک سینۂ مینا دھڑکتا ہے
نہ جانے تُندیٔ جذبات سے حالت ہو کیا دل کی

تحمل سنگ سے مانگ اور استقلال ساحل سے
اور اِن اجزا سے پھر تکمیل کر اس مضطرب دل کی

کرشمے ہیں یہ صفدر اضطرابِ خودنمائی کے
تپش کیا مہرِ تاباں کی ضیا کیا ماہِ کامل کی

جون ۱۹۳۶ء

* * *

مَیں دل کو دیکھتا ہوں کہ وہ دل نہیں رہا
یعنی ترے خیال کی منزل نہیں رہا

دُنیا کے التفات کے قابل نہیں رہا
جو دل تری نظر سے گرا دل نہیں رہا

اقرارِ قُرب پھر متبسّم لبوں سے ہے
پھر حشر اعتبار کے قابل نہیں رہا

اللہ رے خیال کی معجز نُمائیاں
مجھ کو گمانِ دُوریٔ منزل نہیں رہا

اِس دل کو کر دیا غمِ دنیا نے پائمال
اب یہ تری نگاہ کے قابل نہیں رہا

آنکھوں میں بُتکدے ہیں تصوّر میں گُل کدے
با ایں ہمہ میں رونقِ محفل نہیں رہا

ہر شے کو دی نظر نے تری تابِ زندگی
لیکن اِدھر اُٹھی تو مرا دل نہیں رہا

جب حالِ دل یہ ہے تو کسی غم کا کیا سوال
اب یہ خوشی کا بھی متحمل نہیں رہا

کس رَو پہ بہہ رہی ہے مری کشتیٔ حیات
ساحل بھی میرے واسطے ساحل نہیں رہا

ہر شوق نامراد ہے ہر سعی رائیگاں
اب کچھ سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا

دیکھا جسے وہ کُشتۂ ناز و اَدا ملا
اب اعتبارِ ابروئے قاتل نہیں رہا

صفدر نگاہِ شوق بھی گستاخ ہو چلی
وہ احترامِ پردۂ محمل نہیں رہا

مئی ۱۹۳۶ء

rekhta

رازو نیازِ عشق کے قابل بنا دیا
اُن کی نظر نے دل کو مرے دل بنا دیا

اس ملگجے لباس پہ آرائشیں نثار
تم نے تو سادگی کو بھی قاتل بنا دیا

برق و شرر کو دے کے تپش اور اضطراب
جو بچ رہا اُسی کو مرا دل بنا دیا

چارہ گری نے آپ کی چھو کر نگاہ سے
ہر آبلے کو درد بھرا دل بنا دیا

اب اُن تجلیوں کا ہو کس طور سے نفوذ
جن کو حیا نے پردۂ حائل بنا دیا

دل ایک مُشتِ خاک تھا تیری نگاہ نے
مٹّی کو سوزِ عشق کے قابل بنا دیا

تیرے ظہورِ حُسن نے تحلیلِ نُور کی
اُجزائے منتشر کو مرا دل بنا دیا

آغازِ ربط میں نگہِ جاں نواز نے
دل کو تری اُمید کے قابل بنا دیا

آنکھوں کو انتظار کی بیداریاں ملیں
سوزِ نفَس کو گرمیٔ محفل بنا دیا

فطرت کو ہے گلہ کہ مرے اضطراب نے
حاصل کو برق، برق کو حاصل بنا دیا

جب شوق تازہ دم تھا تو منزل بھی راہ تھی
جب تھک گئے تو راہ کو منزل بنا دیا

صفدر یہ اُن کی فتنہ خرامی تو دیکھیے
پھولوں پہ پاؤں رکھ کے اُنھیں دل بنا دیا

اپریل ۱۹۳۶ء

آنکھوں میں عشوہ ہائے فسوں گر لئے ہوئے
خلوت میں بھی وہ آئے ہیں محشر لئے ہوئے

کس نے چھڑک دی آ کے بیاباں پہ زندگی
ذرّے اُٹھے ہیں حسنِ منوّر لئے ہوئے

محشر میں جب پکار ہوئی اہلِ عشق کی
ہاتھوں پہ آئے ہم دلِ مضطر لئے ہوئے

اے تیغِ ناز اِدھر بھی اُچٹتا سا کوئی وار
ہم بھی فرازِ دوش پہ ہیں سر لئے ہوئے

آنکھیں ہجومِ گُل میں تجھے ڈھونڈھتی رہیں
میرے تصوّرات کا پیکر لئے ہوئے

پیمانے سب کے بھر گئے مینا تہی ہوا
ہم رہ گئے تصوّرِ ساغر لئے ہوئے

ہر نقشِ پا پہ جُھک گئی پیشانیٔ نیاز
تھا ذوقِ سجدہ کب سے مرا سر لئے ہوئے

قیامت میں برق چال میں فتنے نظر میں سحر
آیا شباب آپ کا محشر لئے ہوئے

آنکھیں ہیں خود چھلکتے ہوئے جام کی طرح
عارض ہیں رنگِ بادۂ احمر لئے ہوئے

اچھا نیازِ عشق کے سجدے نہ ہوں قبول
جاتے ہیں لیجیے دلِ مضطر لئے ہوئے

تاثیرِ خونِ اہلِ وفا رنگ لائی ہے
ہر برگِ گُل چمن میں ہے محضر لئے ہوئے

صفدرؔ یہ میرا دل ہے محبت کا آئینہ
اِک حسنِ دل نواز کا جوہر لئے ہوئے

مارچ ۱۹۳۶ء

بنا دے اے نگہِ لطف بے قرار مجھے
بلا سے گر نہ رہے دل پہ اختیار مجھے

ستا نہ اے نگہِ ناز بار بار مجھے
رہا نہ تیرے تبسّم پہ اعتبار مجھے

خوشا وہ عالمِ بیتابیٔ فراق کہ جب
مزے کی چیز تھی تکلیفِ انتظار مجھے

کسی کے حُسن کی رعنائیاں شباب پہ ہیں
رِجھا سکے گا نہ اب عالمِ بہار مجھے

کہاں وہ موجِ تبسّم کہاں گلوں کی ہنسی
دیا فریب شباہت نے بار بار مجھے

میں کاروبارِ چمن سے خفا تو تھا لیکن
منا کے لے گئی رنگینیٔ بہار مجھے

اب اُن جھکی ہوئی نظروں سے گفتگو کیا ہو
کہ معذرت نے کیا جن کی شرمسار مجھے

دُعا ہے یہ کہ نہ بدلے ستمگری کا مزاج
دُعا ہے یہ کہ نہ آئے کبھی قرار مجھے

پکارتا ہی رہا آشیاں کا ہر تنکا
اڑا کے لے ہی گیا جلوۂ بہار مجھے

تری جفا بھی نہ ہو مستقل تو کیا شکوہ
رہا نہ اپنی وفا پر بھی اعتبار مجھے

اُسی پکار پہ اب تک ہے شوقِ گرمِ خرام
تمہارے دل نے پکارا تھا ایک بار مجھے

خلا میں دُور ستارا سا ٹمٹماتا ہے
کہاں یہ چھوڑ گئی لا کے یادِ یار مجھے

یہ سُرخ سُرخ سے ڈورے یہ مست مست نگاہ
بنا نہ دیں کہیں صفدرؔ گناہگار مجھے

۲۲ فروری ۱۹۳۶ء

rekhta

عشق نامعتبر نہ ہو جائے   خامشی فتنہ گر نہ ہو جائے

زلفِ پیچاں کے اِنتشار کو روک   شوق آشفتہ سر نہ ہو جائے

لُطف غارت نہ ہو تمنا کا   آہِ دل با اثر نہ ہو جائے

لذّتِ درد کی دُعائیں ہیں   کیوں خفا چارہ گر نہ ہو جائے

یہ دلِ بے خبر یہ لطفِ نگاہ   آشنائے نظر نہ ہو جائے

چھِن نہ جائے نشاطِ بے خبری   آگہی دردِ سر نہ ہو جائے

دلِ بے تاب یہ تری دھڑکن   موت کی راہبر نہ ہو جائے

یہ ہم آغوشیاں تصور میں   کہیں اُن کو خبر نہ ہو جائے

نہ میسر اگر ہو لذتِ عشق   زندگی دردِ سر نہ ہو جائے

اُن کے وعدے اگر وفا ہو پائیں
زندگی معتبر نہ ہو جائے

جنوری ۱۹۳۶ء

rekhta

ترے غم کی ہر سُو فراوانیاں ہیں
اُفق تا اُفق دل کی ویرانیاں ہیں

خرد بھی پشیماں جنوں بھی پشیماں
بقدرِ طلب سب کو حیرانیاں ہیں

ہوا لہکی لہکی، گھٹا بہکی بہکی
نہ بہکے تو یہ دل کی نادانیاں ہیں

نہ پوچھو اس آغوشِ ارماں کی رونق
کہ آباد ہو کر بھی ویرانیاں ہیں

غمِ دل کی یہ سوگواری نہیں ہے
بنامِ محبت تن آسانیاں ہیں

ہجومِ تجلّی میں گُم ہیں نگاہیں
نظر بندیاں ہیں کہ تابانیاں ہیں

ابھی تک تذبذب ہے یہ ذوقِ ایماں
بڑی دل رُبا کُفر سامانیاں ہیں

بڑھیں ایسی دشواریاں زندگی کی
میسر ترے غم کی آسانیاں ہیں

یہ آنسو تسلّی سے کیا رُک سکیں گے
کہ دل میں وہی شعلہ سامانیاں ہیں

تجلّی کے سینے میں بھی اِک شرر ہے
اسی کا نتیجہ یہ تابانیاں ہیں

زمانہ نہیں چاک دامانیوں کا
جدھر دیکھیے پاک دامانیاں ہیں

ہوس کیوں اُسے پاک دامانیوں کی
میسّر جسے چاک دامانیاں ہیں

شریعت کی دانائیاں اِن پہ صدقے
یہ صفدرؔ محبت کی نادانیاں ہیں

۱۹۳۵ء

پھانس اِک رہ گئی اِدھر دیکھو
دیکھو دیکھو پھر اک نظر دیکھو
سوزِ پروانہ ایک لمحہ ہے
شمع جلتی ہے رات بھر دیکھو
ہو گئی مانوسِ تیرگی جو نگاہ
کتنی جلدی ہوئی سحر دیکھو
بسکہ ہے پاسِ درد بھی اِک درد
تم بھی سوئے نہ رات بھر دیکھو
دل تمہارے لئے لہو ہو گا
اب کوئی دم میں ہے سحر دیکھو
عظمتِ دید کا تقاضہ ہے
آنکھ بیکار ہو مگر دیکھو
خود بھی ہیں گردشوں میں اسیر
چاند کا رات بھر سفر دیکھو

لوگ جاتے ہیں سوئے دیر و حرم
تم بھی صفدؔر کسی کا گھر دیکھو

۱۹۳۵ء

جب ہمیں دل پہ اختیار آیا   حُسن خود ہو کے بے قرار آیا
سر جُھکائے گنہگار آیا   اُن کی شانِ کرم کو پیار آیا

لے مجھے دل پہ اختیار آیا   تیرے غمزوں کو بھی قرار آیا
ایک دھجی نہیں گریباں میں   ہائے کب موسم بہار آیا
اُن کا جلوہ تھا آئینہ بردار   گیسوئے زیست میں سنوار آیا
سادہ لوحی تو دیکھئے دل کی   جھوٹے وعدوں پہ اعتبار آیا
اُن کی محفل سے عشق کیا لاتا   بوجھ جو دل پہ تھا اُتار آیا
اب تو ہے جمع خاطری کا سوال   تیری دُنیا کو میں سُدھار آیا
نہ ملا میری بندگی کا جواب   بُتکدے میں بھی میں پکار آیا

دل میں صفدرؔ کسی کا عکس نہیں
شاید آئینہ میں غبار آیا

۱۹۳۵ء

پھر ملتجی ہے شوقِ نگاہِ عتاب کا   کچھ حوصلہ بڑھا دلِ خانہ خراب کا
جنبش میں دل کی طرح ہے گوشہ نقاب کا   رُخ پھر نہ جائے اُن کی طرف آفتاب کا
عارض کی سرخیاں ہیں کہ رودادِ خونِ دل   رودادِ خونِ دل ہے کہ عالم شباب کا
جلووں نے جیسے لوٹ لیا عقل و ہوش کو   آنکھوں کو صرف یاد ہے اُٹھنا نقاب کا
وہ پھول چُن لیا کہ جو تھا حاصلِ بہار   قائل ہوں عشق کی نگہِ انتخاب کا
ہم سُن رہے ہیں جیسے کوئی اجنبی سُنے   کچھ لوگ کہہ رہے ہیں فسانہ شباب کا
پندارِ حسن و جذبِ نظر میں ہے کشمکش   حافظ خدا ہے آپ کے بندِ نقاب کا
آنچل کا کیا قصور، ہواؤں کی کیا خطا   چھپتا نہیں ہے آپ ہی عالم شباب کا
زیرِ نقاب کچھ ہے اگر شدّتِ جمال   اُلٹے گا خود بخود کوئی گوشہ نقاب کا
پوچھ اُس کی سرخوئی سے مرے خونِ دل کا حال   عارض پہ ہے جو رنگِ گلابی شباب کا

صفدر جگا رہی ہیں زمانے کی ٹھوکریں
لیکن ہنوز شوق پہ عالم ہے خواب کا

۱۹۳۵ء

درس دیتی رہی نیرنگیٔ عالم مجھ کو
کچھ سکھاتا رہا ربطِ گل و شبنم مجھ کو

کامراں کون ہوا کس کو ملی دادِ وفا
کیوں ہو اپنے دلِ ناکام کا ماتم مجھ کو

تم میں با ہوش جو ہوں اُن کو مبارک رہیں ہوش
کیا یہ کچھ کم ہے نہیں فکرِ دو عالم مجھ کو

میری غیرت اسے توہینِ وفا سمجھے گی
غیر کو بھی وہ عطا ہو جو ملا غم مجھ کو

رو دیا میں جن کیلئے وہ مری قسمت پہ ہنسے
راس آئی نہ وفا صورتِ شبنم مجھ کو

اپنی تخئیل کے گُل اپنے تصور کے صنم
نظر آئے ترے پیکر میں مجسّم مجھ کو

اپنی محرومیٔ قسمت کا گلہ کیا صفدر
میں نے کی جس سے وفا اُس نے دیا غم مجھ کو

۱۹۳۵ء

rekhta

جب گردشِ حیات سے ہم تنگ آئیں گے
آنکھوں کو اُن کی چوم کے ساغر اُٹھائیں گے

ہم سے اُمیدِ رنگِ وفا ہے زمانے کو
ہم ہیں جو اعتبارِ محبت بڑھائیں گے

تعمیرِ آشیاں کا اگر حوصلہ رہا
ہم بجلیوں کی زد پہ بھی تنکے جمائیں گے

مجروح ہو نہ جائے کہیں اُن کا اعتماد
سُنتے ہیں غیر پردہ ستم آزمائیں گے

سِلوا رہا تھا اپنا گریباں جنونِ عشق
اِس کی خبر نہ تھی کہ وہ پھر مُسکرائیں گے

دونوں طرف سے ناز ہے اب مائلِ نیاز
صفدر کو آپ، آپ کو صفدر منائیں گے

۱۹۳۵ء

rekhta

ہم سے روشن ہوا نام آپ کی زیبائی کا
کلمہ پڑھتے رہے ہم حُسن کی یکتائی کا

اس نتیجے میں ہے کیا دخل تمنائی کا
تیرا ہی جلوہ ہے باعث تری رُسوائی کا

کس کی زلفوں کے تصوّر سے ہے تاریک فضا
جھلملاتا ہے دیا عشق کی بینائی کا

مُدعیانِ خرد توڑ دیں زنجیر اپنی
یہ بھی نقشا ہے ترے حُسن کی انگڑائی کا

صبحِ عشرت پہ ہوئی یورشِ ظلمت ایسی
رات سے مل گیا عالم مری تنہائی کا

دیدنی ہے یہ ترا چاکِ گریباں اے عشق
کس سے سیکھا ہے سلیقہ یہ خود آرائی کا

کس کی وحدت سے ہے حیرت مری یک بینی کی
کس کی خلوت سے ہے عالم مری تنہائی کا

نئی دُنیا میں بھی محبوب ہے یہ رسمِ کُہن
کون مُنکر ہے محبت کی دل آرائی کا

دل کی آنکھوں میں چکا چوند ہے صفدرؔ ہشیار
امتحان لیتے ہیں جلوے تری بینائی کا

۱۹۳۵ء

آنکھیں جو کھلیں صفدرؔ زنجیر نظر آئی
یہ خوابِ جوانی کی تعبیر نظر آئی

رگ رگ میں محبت کی تنویر نظر آئی
اِک پیکرِ خاکی کی توقیر نظر آئی

آفاق کا ہر جلوہ اپنا ہی کرشمہ ہے
آئینوں میں اپنی ہی تصویر نظر آئی

کُھلنے جو لگے عقدے اُس گیسوئے پُرخم کے
اے لفظِ وفا تیری تفسیر نظر آئی

اِک عجز سراپا ہے اِک نازِ مجسّم ہے
تصویر کے پہلو میں تصویر نظر آئی

ہموار زمینوں پر تدبیر کے جلوے تھے
ٹھوکر جو کہیں کھائی تقدیر نظر آئی

جب گِھر کے گھٹا آئی بھڑکا ترا دیوانہ
لہرائی ہوئی بجلی زنجیر نظر آئی

صفدرؔ نے کیا جب بھی غور اپنی تمنا پر
تخریب ہم آغوشِ تعمیر نظر آئی

۱۹۳۴ء

آنسوؤں کی چند بوندیں زیبِ مژگاں ہو گئیں
میری خوش فہمی سے میرے حق میں طوفاں ہو گئیں

دیدنی تھا اُن کا اطمینان میرا اضطراب
سو طرح زلفیں بنیں اور پھر پریشاں ہو گئیں

دو دلوں میں چل رہی تھی مدتوں سے گفتگو
آج نظریں بھی شریکِ عہد و پیماں ہو گئیں

آئینہ دارِ مزاجِ حسن ہیں زلفیں تری
جب مرے آغوش تک آئیں پریشاں ہو گئیں

ہُو کا عالم کیوں نہ ہو دل میں کہ اِک اُمید نے
بستیاں جتنی بسائی تھیں وہ ویراں ہو گئیں

وقتِ آسائش بھی اُلجھن سے نہیں دل کو فراغ
خواب کے عالم میں وہ زلفیں پریشاں ہو گئیں

ذہن اُن پرچھائیوں کا اب تعاقب کیا کرے
صحبتیں ماضی کی جو خوابِ پریشاں ہو گئیں

داستاں میں رنگ کیا بھریئے جگر میں خوں کہاں
چند بوندیں تھیں جو صفدرؔ زیبِ عنواں ہو گئیں

۱۹۳۴ء

جنوں کو ننگ ہے پابندِ اسلوبِ بیاں ہونا
فغاں کو چاہئے ہر حال میں صفدر فغاں ہونا

غبارِ راہ بن بن کر یہاں ہونا وہاں ہونا
لکھا تھا میری قسمت میں دلیلِ کارواں ہونا

تبسّم کا تکلّم اور خموشی کا زباں ہونا
عجب انداز سے ٹھہرا ہے دل کا امتحاں ہونا

ہر اک قطرہ چمن میں لالہ و گُل بن کے مہکے گا
نہیں ممکن شہیدوں کے لہو کا رائیگاں ہونا

وہ لذّت چھن گئی دردِ محبت جس پہ نازاں تھا
کسی کا مہرباں ہونا بھی ہے نامہرباں ہونا

کبھی تو لے گا اپنا قرض اے تیرے خوابِ شیریں سے
مرا پچھلے پہر اُٹھ اُٹھ کے سرگرمِ فغاں ہونا

محبت بھی نہیں محفوظ قانونِ تغیّر سے
یہ وہ لذّت تھی جس کو چاہئے تھا جاوداں ہونا

زمانہ سُن رہا ہے فخر کر اے میری رُسوائی
تری قسمت میں لکھا تھا کسی کی داستاں ہونا

رہے اے ہمنشیں ہم موسمِ گُل میں بھی پژمردہ
ہمیں کب راس آیا زینتِ باغِ جہاں ہونا

فسونِ عشق کی نیرنگیاں ہیں کوئی کیا جانے
ہمارا اعتبارِ شوق اُن کا بدگماں ہونا

یہ دُنیا جو کہے لیکن مبارک ہو تجھے صفدر
کسی کی داستاں میں تیرا زیبِ داستاں ہونا

دسمبر ۱۹۳۳ء

ہونٹ جنبش میں ہیں چپ کا بیمار نہیں
یہ مگر حسرتِ گفتار ہے گفتار نہیں

ہم تو سر پھوڑ کے مرنے پہ بھی آمادہ ہیں
آپ شمشیر اُٹھانے کو بھی تیار نہیں

سامنے راہِ عدم اور مسافر تنہا
کوئی بستی نہیں کوچہ نہیں بازار نہیں

تیرے تیور ہی ترے قول کو جھٹلاتے ہیں
آنکھیں کچھ کہتی ہیں اور لب پہ ہے ہر بار نہیں

اِک پراگندگیٔ عام کا عالم ہر سمت
کیا یہ دُنیا تری اُٹھتا ہوا بازار نہیں

یہ بھی احسان تھا اُن کا کہ اُٹھائی نہ نقاب
جانتے تھے کہ ہمیں طاقتِ دیدار نہیں

ضعفِ ارادے کا ہے طاقت کی کمی کا فیضان
سوچئے یوں، تو گنہگار، گنہگار نہیں

اے چمن تجھ کو خزاں نے مجھے تو نے لوٹا
یوں لُٹا ہوں کہ گریباں میں کوئی تار نہیں

شرطِ انصاف ہے، ہو اس کا تحمل کیوں کر
گریۂ دوست ہے یہ خندۂ اغیار نہیں

دونوں ہی دل کے اشارے پہ ہیں سرگرمِ خرام
عشق اور عقل میں صفدر کوئی پیکار نہیں

مارچ ۱۹۳۳ء

Rekhta

○

وہ اِک رازِ عیاں تھے ہو گئے آخر نہاں کیوں کر
تجلّی بن گئی صفدر حجابِ درمیاں کیوں کر

ہجومِ آرزو اِس دل کی ویرانی سے گھبرایا
ٹھہرتا منزلِ ویراں میں کوئی کارواں کیوں کر

وہ آنکھوں میں ہیں لیکن دل کی منزل دُور ہے پھر بھی
انھیں سے کوئی پوچھے ہوں گی طے یہ دُوریاں کیوں کر

حقیقت میں نظر تو بام پر بھی جا نہیں سکتی
بناتا ہے تصور آسماں پر آسماں کیوں کر

ہے اِک آنسو کا قطرہ گوشۂ چشمِ تغافل میں
غرورِ حُسن اک طوفاں کو رکھتا ہے نہاں کیوں کر

ہوائے تُند کا احساں ہے میری خاک پر ورنہ
زمانے پر عیاں ہوتیں مری بربادیاں کیوں کر

وفا صفدر کی بے شک مجرمِ یک جنبشِ لب ہے
زباں رکھتے ہوئے بن جائے کوئی بے زباں کیوں کر

دسمبر ۱۹۳۲ء

رنگ و نیرنگِ جہاں شام و سحر دیکھا کیے
اِک تماشا تھا جسے ہم عمر بھر دیکھا کیے

ابر سے چلمن کے جھانکا بھی نہ سورج نے کبھی
اور سورج کے پجاری سُوئے در دیکھا کیے

شمع کی تنویر گو بڑھتی رہی گھٹتی رہی
ٹکٹکی باندھے مگر ہم تا سحر دیکھا کیے

نامرادانِ چمن کھولے ہوئے آغوشِ شوق
نکہتِ آوارہ کی گردِ سفر دیکھا کیے

دیدنی تھی دونوں جانب احتیاطِ ضبطِ شوق
ہم اِدھر دیکھا کیے اور وہ اُدھر دیکھا کیے

گردِ محمل بھی نظر آئی نہ صفدرؔ دُور تک
صبح سے تا شام سوئے رہگذر دیکھا کیے

۱۹۳۲ء

rekhta

بلا سے، دل میں رہے، دل کے پار ہو جائے
مگر نگاہِ کرم ایک بار ہو جائے

مری وفا پہ تجھے اعتماد ہو کہ نہ ہو
تری جفا پہ مجھے اعتبار ہو جائے

نہ نکہتیں ہوں پریشاں نہ سینہ چاک ہو گل
چمن پہ میرا اگر اختیار ہو جائے

ہے شانہ ہاتھ میں اور سامنے ہے آئینہ
ہے وقت وہ کہ شکاری شکار ہو جائے

خزاں سے پہلے ہی آئے گی اس کے دل پہ خزاں
جسے بہار میں پھولوں سے پیار ہو جائے

۱۹۳۲ء

rekhta

محبت اُن کی کہتی ہے مرے دل میں نہاں ہو کر
تجھے بے چین رکھوں گی مَیں بے نام و نشاں ہو کر

حقیقت یوں بھی اپنے راز کی تشریح کرتی ہے
یہ کہتا ہے مرا چاکِ گریباں دھجیاں ہو کر

الٰہی خیر اُن کا راز ہونٹوں تک نہ آجائے
محبت لے رہی ہے چٹکیاں دل میں نہاں ہو کر

جہاں ہے دھوپ عارض کی وہاں زلفوں کا سایہ بھی
دلِ سوزاں کو ٹھنڈک دے رہا ہے سائباں ہو کر

سُوئے پستی جُھکے، جُھکنا پڑا بارِ بلندی سے
کُھلی ہم پر بلندی کی حقیقت آسماں ہو کر

یہی عشوے جو ہم سے مانگتے ہیں اِک نظر صفدرؔ
یہی نقدِ خودی مانگیں گے کل ہم سے جواں ہو کر

۱۹۳۲ء

وہ عشق ہو کہ خرد کچھ تو دو خدا کے لیے
اِک آگ چاہیے خاشاکِ ماسوا کے لیے

مریضِ عشق کی آنکھوں میں خیرگی آئی
نقاب اب تو اُلٹ دیجئے خدا کے لیے

یہی وہ ہیں جنھیں معصوم کہتی تھی دنیا
وہی ہیں یہ کہ جو مشہور ہیں جفا کے لیے

ہوس نے بھی تو کیا تیرا احترام اے حُسن
نقاب عشق کی اوڑھی تری حیا کے لیے

ہماری خاک بھی اُٹھوا رہے ہیں کوچہ سے
کہے یہ کون کہ رہنے بھی دو خدا کے لئے

وفا کا بھیس بدل کر جو دل کو دے تسکیں
ترس رہے ہیں بہت دن سے اس جفا کے لیے

وہ ہاتھ جن میں کہ تھی کل تلک چھُری صفدرؔ
اُٹھے ہیں آج مری قبر پر دُعا کے لیے

۱۹۳۲ء

نظر آتا نہیں دریا کا کنارا ہم کو
لئے جاتا ہے کہاں وقت کا دھارا ہم کو

دیکھ لو گرم نگاہوں سے دوبارا ہم کو
بھا گیا ہے یہی انداز تمہارا ہم کو

طنزِ اغیار سے کچھ کم نہیں پندِ احباب
آپ کے عشق میں یہ بھی ہے گوارا ہم کو

سمتیں ہونے لگیں دریائے محبت کی عیاں
مل ہی جائے گا کسی روز کنارا ہم کو

کوششِ ضبطِ مسلسل سے بنا شوقِ جنوں
مرضِ عشق میں پرہیز نے مارا ہم کو

وہ بلندی کہ جہاں سے ہو حقیقت مشکوک
نہیں اے عالمِ پرواز گوارا ہم کو

مختصر یہ کہ کہیں کے نہ رہے ہم صفدر
عشق میں فرض کے احساس نے مارا ہم کو

۱۹۳۲ء

rekhta

ہم تو دُوری میں بھی قُربت کا مزا لیتے ہیں
دل میں اِک چاند سی تصویر بنا لیتے ہیں
کس کو پہچان ہے سنگِ درِ جاں کی یہاں
جو بھی چوکھٹ ہو سرِ عجز جھکا لیتے ہیں
سینۂ شوق ہے ہر چند کہ قلزم بہ سبو
کوئی طوفاں مگر اُٹھے تو دبا لیتے ہیں
سونے لگتی ہیں فضائیں تو ترے دیوانے
اپنی سوئی ہوئی زنجیر جگا لیتے ہیں
وہ ترا شعلۂ رُخ ہو کہ مساجد کا چراغ
جن کو اِک شمع جلانی ہے جلا لیتے ہیں
دو نگاہوں میں تصادم تو بڑی بات نہیں
لوگ ہر بات کو افسانہ بنا لیتے ہیں
صفدرؔ اِک ہم ہیں کہ ہے سر پہ جہاں کا احساں
ایک وہ ہیں جو زمانے کی دُعا لیتے ہیں

۱۹۳۲ء

rekhta

وہ بیٹھے بیٹھے ہوئے کیوں خفا خدا جانے
ہوئی ہے کون سی ہم سے خطا خدا جانے

درازیٔ شبِ ہجراں کا سلسلہ مت پوچھ
کہاں سے آئی یہ کالی بلا خدا جانے

تری نگاہ بھی معصوم، حسن بھی معصوم
سکھائی کس نے یہ طرزِ جفا خدا جانے

ہر ایک جذبۂ مبہم کی ہو چکی تحلیل
مگر مزاجِ محبت ہے کیا خدا جانے

حیات و موت کے حلقے ہیں تا بہ حدِ نگاہ
کہاں پہ ختم ہو یہ سلسلہ خدا جانے

یہ بار بار جو آتی ہیں ہچکیاں صفدر
کسی نے یاد مجھے کیوں کیا خدا جانے

۱۹۳۲ء

rekhta

○

ایک دم بھی جسے اِس دل سے بھُلایا نہ گیا
وہ قریب آیا تو سینے سے لگایا نہ گیا

کر دیا جلوۂ رُخسار نے ایسا بے خود
ہم سے احوالِ دلِ زار سُنایا نہ گیا

اجنبی بن کے سرِ راہ ملے ہیں مجھ سے
جن کی دیوار کا سر سے مرے سایا نہ گیا

میرے پہلو میں جو اِک چیز تھی کیا ہو گئی وہ
ہم ہیں اور تم ہو، یہاں پر کوئی آیا نہ گیا

یوں تو اس دوش پہ سَو بارِ گراں تھے لیکن
ناز اک تیری محبت کا اُٹھایا نہ گیا

بڑھ گیا فرض کا احساس جنوں کی حد تک
لیکن اس سر سے تری زلف کا سایا نہ گیا

پی گیا اشک کا طوفان بھی صفدر لیکن
رنگ چہرے کا بہر حال چھپایا نہ گیا

۱۹۳۲ء

اگر وہ بھُول کے بھی یاد کر لیا کرتے
تو ہم بھی عرضِ تمنّا کا حوصلہ کرتے

نگاہِ مہر تھی غیروں پہ ہم پہ چشمِ عتاب
یہی تھا دل میں تو انصاف بھی کیا کرتے

خدا بنا لیا ہم نے بھی حُسن والوں کو
پرستش اِس سے زیادہ بُتوں کی کیا کرتے

اُنہیں کا نام تھا وردِ زباں ہر اک لمحہ
اُنہیں نے درد دیا تھا وہی دوا کرتے

تبسمِ لبِ نازک کی یاد گر آتی
دوا کو درد تو اِس درد کو دوا کرتے

یہ اپنی شومیِ قسمت کہ اُٹھ سکا نہ نقاب
زمانہ ہو گیا ہم سے اُنھیں حیا کرتے

۱۹۳۲ء

rekhta

یہ دُنیا ہے خدا کا کارخانہ یوں ہی چلتا ہے
جو جَلتا ہے سو کھلتا ہے جو کھلتا ہے سو جَلتا ہے

نہ وہ تم ہو نہ وہ ہم ہیں مگر اب بھی یہ حالت ہے
کوئی جیسے کہ سینے میں کلیجے کو مَسلتا ہے

لگن کس کی ہے یہ آخر، کشش کس کی ہے یہ آخر
کہ سرمستِ ازل ہر گام گِر گِر کر سنبھلتا ہے

کوئی پوچھے تو کہہ دینا مریضِ غم کی بیتابی
تصوّر میں کسی کے ہر نفس کروٹ بدلتا ہے

یہ دُنیا فرض کی دنیا نہیں بازار ہے صفدرؔ
یہاں تو عشق بھی اب عقل کے سانچے میں ڈھلتا ہے

١٩٣٢ء

نوائے پریشاں

متفرق اشعار

rekht

جب ذہن پہ دَمکے نہ لگاتار شرارے

تخیّل نے چِھٹکائے پراگندہ ستارے

نہ روم و رَے کی نہ چین و خُتن کی بات کرو
خود اپنے گھر کو سنوارو وطن کی بات کرو

بسی ہے ذہن میں اب تک خزاں کی ویرانی
بہار روٹھ نہ جائے چمن کی بات کرو

جہاں سے نغمۂ دل بے سُنائے لوٹ آئے
دھڑکتے دل سے اُسی انجمن کی بات کرو

یہ تلخیٔ غمِ ایّام کم جو کرنی ہو
تو دوستو کسی شیریں سخن کی بات کرو

دیارِ غیر کے پھولوں کو پوجنے والو
کبھی تو اپنے گُل و یاسمن کی بات کرو

حیات موت کے آغوش تک جب آ پہنچی
تو خلعتوں کی نہیں اب کفن کی بات کرو

اگر قبول ہو صفدر کی یہ نوا سنجی
تو دل نوازیٔ اربابِ فن کی بات کرو

دسمبر ۱۹۶۲ء

شورِ ناقوس میں اندازِ اذاں ہے کہ جو تھا

عکس تیرا کسی چہرے میں نہیں ملتا ہے
آئینہ بزم میں ہر سُو نگراں ہے کہ جو تھا

نگہ و جلوہ میں باقی ہے ابھی تک دُوری
بیچ میں پردۂ باریکِ گُماں ہے کہ جو تھا

حسن اور عشق میں اب تک ہے وہی ربطِ قدیم
خونِ دل غازۂ رخسارِ بتاں ہے کہ جو تھا

ہر طرف دانش و دیں کی ہیں دُکانیں صفدرؔ
چار سُو معرکۂ سود و زیاں ہے کہ جو تھا

اکتوبر ۱۹۶۲ء

بے داغ ہی رہی تیری معصوم سادگی
گو لاکھ رنگِ شوق بھرے جا رہا ہوں میں

○

اب تک ہے یاد اُن کی اُچٹتی ہوئی نگاہ
اک چوٹ تھی کہ دل پہ سہے جا رہا ہوں میں

○

محرومیوں پہ کوئی تو آنسو بہائے گا
افسانۂ حیات لکھے جا رہا ہوں میں

○

اِک منفعل نگاہ ہے سرمایۂ حیات
اِک لَو لگی ہوئی ہے جیے جا رہا ہوں میں

○

تری نگاہِ کرم نے دیئے ہیں درسِ وفا
ترے خلوص سے سیکھی ہیں وسعتیں دل نے

بنا لیا ہے رقیبوں کو راز داں میں نے

* * *

نہ چھیڑ اے مطربِ رنگیں نوا یہ ساز رہنے دے
دبا رکھا ہے سینے میں کسی کا راز رہنے دے

* * *

ہجومِ جلوہ ہے وجہِ سکوت اے صفدرؔ
مذاقِ دید نے تصویر کر دیا ہے مجھے

* * *

حیرت ہے میری آئینۂ حشرِ آرزو
تصویر بن گیا ہوں کسی کے خیال میں

◆

نگاہِ شوق کو پھر شغلِ مے پرستی ہے
حریمِ حُسن سے چَھن چَھن کے مے برستی ہے

◆

اُن کا جلوہ نہ سہی اُن کا تصوّر ہی سہی
شمعِ غم خانہ کسی کو تو بنایا ہوتا

◆

ہوش میں کوئی کب نہیں ہوتا
جب وہ ہوتے ہیں تب نہیں ہوتا

◆

فریبِ آرزو میں طالبِ دیدار بیٹھے ہیں
نکل کر بزم سے اُن کی پسِ دیوار بیٹھے ہیں

◆

اُس کو فریب دے نہ سکے گا فسونِ دہر
جس کی نظر پہ رازِ دو عالم ہو آشکار

◆

برہمی زلفوں کی راز اک کہہ گئی
آبروئے تیرہ بختی رہ گئی

rekhta

رقصِ طاؤس

○ شادابیٔ تخئیل

○ شگفتگیٔ بیان

○ نفسیاتی دقیقہ سنجی —— اور

○ جدید تمثال نگاری —— کا جمال

ڈاکٹر سیّد صفدر حسین کی نظموں کے مجموعہ "رقصِ طاؤس" میں موجود ہے جس کے متعلق حضرتِ جوش ملیح آبادی نے فرمایا

اللہ رے ترے شعر کا تابندہ جلوس
نظروں کو مٹھاس ہو رہی ہے محسوس
لفظوں کا سجاؤ ہے کہ تختِ بلقیس
معنی کا بہاؤ ہے کہ "رقصِ طاؤس"

یہ خوش رنگ مرقع شائع ہو چکا ہے

قیمت چار

rekhta